September
2021
ماہنامہ
بیاض
لاہور
6 ستمبر
یوم دفاع
Use Mask
Stay Safe

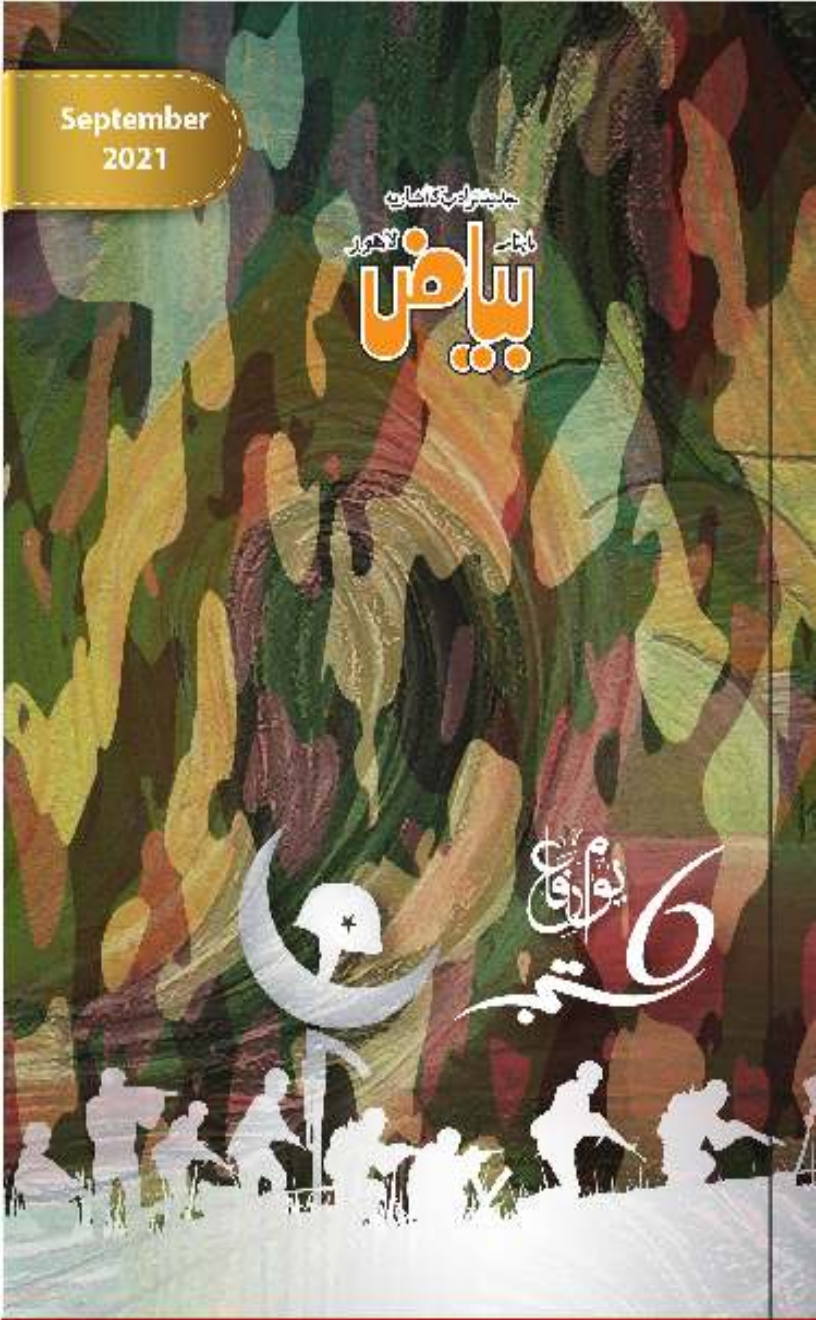

افسانے
راز سکوہ

خندہ نواز

عشق کا فیض

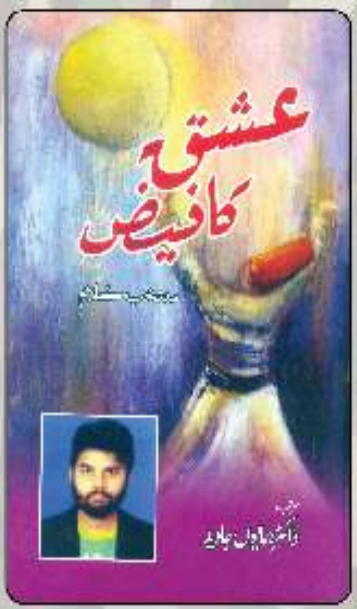

چراغِ اخوت
رشید آفرین

غزل

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

چوٹ ہو پیار بھرے لہجے میں
ماریئے پھول سا پتھر مجھ کو

میرے ہونٹوں پہ ہے سب کے دل کی
ڈھونڈیئے اپنے ہی اندر مجھ کو

اس تموج میں کنارا کیسا
لے چلی لہر بہا کر مجھ کو

میں کہ مفہوم ہوں پہنائی کا
دشت سمجھیں نہ سمندر مجھ کو

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - ستمبر 2021 - شمارہ نمبر: 9

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ دفاعِ پاکستان

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر روڈ نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	آصف ثاقب، ریاض مجید، حسن عسکری کاظمی سید ریاض حسین زیدی، حامد یزدانی، سرور حسین نقشبندی	7 تا 12
2	نعت	آصف ثاقب، ریاض مجید، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز اکرم ناصر، حامد یزدانی، ذکی طارق، سرور حسین نقشبندی	13 تا 20
3	رباعیات	محمد ارشاد، خاور اعجاز	21 تا 23
4	قطعات	انعام الحق جاوید	24
5	گیت	گلزار بخاری	25
6	ہائیکو	افروز رضوی	26
7	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	27 تا 30
8	شعیب بن عزیز ایک شاعر مطالعہ	سیدہ آیت گیلانی	31 تا 37
9	افسانے	فرحت پروین، دردانہ نوشین خان، کلیم خارجی، آغا گل، لبنیٰ مقبول	38 تا 72
10	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	73 تا 82
11	یادیں	رخشندہ نوید	83 تا 89
12	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی رفیع الدین راز، اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر	90 تا 164

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
12	غزلیں	خاور اعجاز، محمد ارشاد، رشید آفرین، راحت سرحدی، سید قاسم جلال، محمد انیس انصاری، باقی احمد پوری، ممتاز راشد لاہوری، علی اصغر عباس، حامد یزدانی، ریاض مجید، اوصاف شیخ، اکرم ناصر، افروز رضوی، طلعت شبیر، افتخار شاہد، یعقوب پرواز، ہارون الرشید، طالب انصاری، احمد جلیل، شوکت محمود شوکت، جسارت خیالی، اقبال سروبہ، ظہور چوہان، تاثیر نقوی، شاعر علی شاعر، ریاض ندیم نیازی، ارشاد نیازی، فائق ترابی، شہاب اللہ شہاب، جمیرا راحت، سعدیہ بشیر، لبنیٰ صفدر، اعجاز روشن، محمود کیفی، رضا اللہ حیدر، اعظم کمال، عقیل رحمانی، نعیم رضا بھٹی، محمد نوید مرزا، آفتاب خان، حسنین سحر، شاہد مانکلی، بشیر احمد حبیب، وسیم عباس، سرور فرحان، شاذیہ اکبر، امر مہکی، ندیم عباس اشرف، ارشد محمود ارشد، اکرم جاذب، اسد رضا سحر، ارسلان ساحل، اسد اعوان، عاصم اعجاز، رانا سرفراز طاہر، جاوید صدیق بھٹی، حمید حیدر اعوان، عاطف جاوید عاطف، انصر رشید انصر، آفتاب محمود شمس، رخسانہ سمن، نائیلہ راٹھور، وسیم جبران، سرفراز عارض، امتیاز انجم، ازور شیرازی، اعجاز رضوی	90 تا 164
13	شاعرِ امروز	سالم سلیم، حسن ظہیر راجہ [شاہد مانکلی]	165 تا 169
14	طنز و مزاح / خاکہ	سیدہ آمنہ ریاض، نور کمال شاہ، گوہر رحمان نوید	170 تا 180
15	مضامین	حامد یزدانی، نثار ترابی، بدر منیر، نیاز لکھویرا، یوسف عالمگیرین، ارشد محمود ارشد، حمزہ یعقوب	181 تا 211
16	نظمیں	امجد اسلام امجد، جلیل عالی، جمیل یوسف، خاور اعجاز، جمیرا راحت، صفدر صدیق رضی، گلزار بخاری، اقبال سروبہ، علی اصغر عباس، شاہنوازی زیدی، شوکت محمود شوکت، محمد نوید مرزا، علی حسین عابدی، مظہر حسین مظہر، امجد بابر، نائیلہ راٹھور، حسین کاظم، فرح شاہد	212 تا 229
17	خطوط	آصف ثاقب، محمد ارشاد، جمیل یوسف، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، آفتاب احمد ملک، طالب انصاری، اشرف کمال، دردانہ نوشین خان، رانا محمد شاہد	230 تا 241

حمد

مقامِ عبد کو مخلوق میں بڑھایا ہے
مرے خدا نے مجھے آدمی بنایا ہے

خدا نے لفظ میں تزئینِ معنوی کر کے
مرے کلام کو تاثیر سے سجایا ہے

کٹا ہے رحم سے اس زندگی کا اک حصّہ
کرم سے اس کے ہی گزرے گا جو بقایا ہے

خدا نے دل میں عقیدت کا نور بھر ڈالا
خیالِ پاک مرے ذہن میں وہ لایا ہے

مرے مکان میں توحید کی فضیلت ہو
مری دعا میں یہی التجا خدایا ہے

لکھی ہے حمد محبت میں ڈوب کر میں نے
مرے شعور کی آنکھوں میں نور آیا ہے

اندھیری رات کی پرچھائیوں نے رقص کیا
خدا کی یاد کا میں نے دیا جلایا ہے

زبانِ عشق پہ ثاقبؔ خدا کے بول رہے
جگر کے درد نے نغمہ اسی کا گایا ہے

آصف ثاقب

حمد

ہمہ اطراف، ہمہ زاویہ، رحمت رحمت
تیرے الطاف کی امید ہے ساعت ساعت

مجھ تن آساں کی ثمر ور رہو، کروں جو کوشش
صحت و عمر میں، اعمال میں، برکت برکت

نورِ اذکار ترا چاہئے لحہ لحہ
ہو ترے ذکر سے روشن مری صحبت صحبت

کرمِ خاص کہ امت نکل آئے اِس سے
ہے زوال آشنا ذہنوں میں جو وحشت وحشت

بچوں اور بوڑھوں کے چہرے ہوں بشاشت ساماں
ہر سو بازاروں میں گلیوں میں ہو بہجت بہجت

ہوں بہار آشنا، اوراقِ خزانی شکلیں
چہرہ چہرہ ہو سکوں، چین ہو صورت صورت

خلد اسلوب ہوں سب زندگی کی ترجیحات
راست انداز سب اعمال ہوں جنّت جنّت

ہوں کسی واضح قرینے سے یہ اظہار پذیر
دل میں جو ٹھہرے ہوئے عکس ہیں حیرت حیرت

تیرے محبوب کا پیغام ہمہ حق، جس پر
مہرِ تصدیق ہے قران کی آیت آیت

غیب سے کوئی کرامت کہ پگھل جائے یہ برف
یہ جو تا حدِ نظر پھیلی ہے غفلت غفلت

میرے اللہ عطا وقت ہو، توبہ کے لئے
خیر کے واسطے درکار ہے مہلت مہلت

پلٹ آ، ذات کے خاموش خلاؤں کی طرف
کر دِلا! فتنے کے ماحول سے ہجرت ہجرت

انتشار آشنا اغراض کے حلقے سے نکل
ہے علاج ایک ہی اِس حرص کا، خلوت خلوت

گنگ جذبوں پہ کرم امّیؐ لقب کے صدقے
عرض اظہار میں در پیش ہے لکنت لکنت

سو دعاؤں کی ہے یہ ایک دعا، مانگ ریاضؔ
''خاتمہ خیر پہ ہو، انت ہو جنت! جنت''

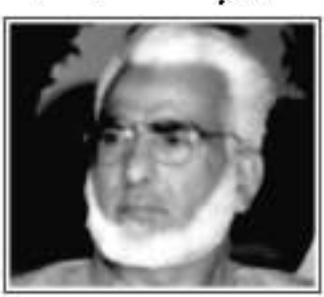

ریاض مجید

حمد

یہ سچ ہے بلندی پہ ترا عرشِ بریں ہے
ہم نے تو جہاں تجھ کو پکارا تو وہیں ہے

نظارہ عجب حضرت آدمؑ کا دکھایا
اک حکم پہ سجدے میں فرشتوں کی جبیں ہے

کل انبیا بھیجے گئے جو تیری طرف سے
اس ایک حوالے سے مقدس یہ زمیں ہے

ممکن نہیں بندوں سے تو برتے کبھی اغماض
تجھ سا کوئی مونس، کوئی غمخوار کہیں ہے؟

اک حرف ہے لا جس سے شناسا کیا تو نے
میں بندہ ہوں تیرا مرے ہونٹوں پہ نہیں ہے

تو ہر جگہ موجود ہے کیا شان ہے تیری
فرمان ہے تیرا کہ تو شہ رگ کے قریں ہے

بخشے گا ہمیں، ہم تری رحمت کے طلبگار
اے قادرِ مطلق! ترے وعدے پہ یقیں ہے

حسن عسکری کاظمی

حمد

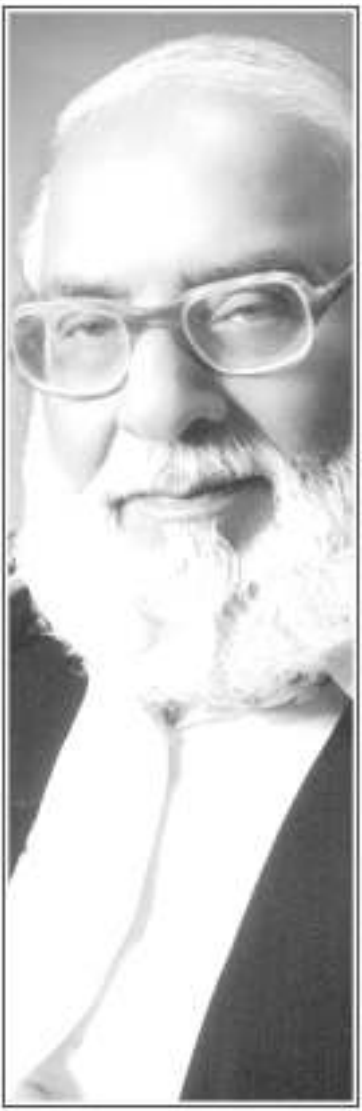

مصیبت کو جب مشکلوں سے گزارا
فقط کام آیا خُدا کا سہارا

سفینہ جو منجدھار میں ڈولتا تھا
اُسی سے ملا ، عافیت کا کنارا

یقینِ مکمل ہو ، وہ راہ بر ہے
کبھی کارواں پر نہ آئے خسارا

ہوں ایثار پیشہ ، سخاوت روش ہو
خزانہ وہ دے گا جہانوں کا سارا

دلِ مردِ مومن میں وہ جاگزیں ہے
ضمیرِ شرافت ہو قائم خُدارا

کبھی رُخ نہ موڑیں رُخِ مصطفےٰ سے
یہ حُکمِ خدا کا ہے واضح اشارا

نہ غیرِ خُدا سے ہمارا ہو ناتہ
نہیں شرک ہرگز عقیدہ ہمارا

یہ توحید ہی روحِ انسانیت ہے
ریاضِ عمل ہے اسی سے دلآرا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

اِس جلوہ گاہِ شام سے

شہرِ سحر تک

خیر کے جتنے دریچے ہیں

ترے ہی نام کی برکت سے کُھلتے ہیں

الٰہی!

یہ جو قصرِ حرف میرے سامنے ہے

اس کا در بھی کھول دے

اظہار کے رنگوں میں کچھ

تاثیر اپنی گھول دے

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

حمد

بندگی کے مدار سے باہر
دشت ہے لالہ زار سے باہر

ہو کرم تو نکل سکوں میں بھی
حیرت و انتظار سے باہر

ایک خواہش امڈ پڑی کل شب
دیدۂ اشکبار سے باہر

اس کا عصیاں شعار بندہ ہوں
جس کی رحمت شمار سے باہر

یاد تیری نکالتی ہے مجھے
ذہن کے خلفشار سے باہر

تیری توفیق سے نکل آیا
آئینے کے خمار سے باہر

مجھ کو اپنی طرف بلاتا ہے
ایک منظر غبار سے باہر

دیکھ آفاق جگمگاتے ہیں
بے یقینی کے غار سے باہر

گھٹنے لگتا ہے دم تخیل کا
حمد کے سبزہ زار سے باہر

میرا ہونا بھی میرا اپنا نہیں
سب مرے اختیار سے باہر

کب ہے دفتر مرے گناہوں کا
رحمتِ کردگار سے باہر

ایک وحشت کا راج ہے سرورؔ
مسندِ انکسار سے باہر

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

زباں پر جب محمد مصطفیٰؐ کا نام آئے
سخن میں دِین ہو، کردار میں اسلام آئے

چلو باندھو کمر اُٹھو مبارک ہو مسافت
کبھی ایسا مدینے سے مجھے پیغام آئے

دعا مانگوں کروں تازہ میں وہ رسمِ شہادت
یہ جاں عشقِ نبیؐ کے امتحاں میں کام آئے

سہانی صبح سے صلِ علیٰ ہو ورد جاری
نبیؐ کی یاد لے کر پھر سہانی شام آئے

چلوں جب میں مدینے کی طرف آنکھیں لگی ہوں
خدا چاہے تو ایسا زیست کا انجام آئے

نبیؐ جی میرے سینے میں ہے بے پایاں عقیدت
خدا کے بعد لب پہ آپ ہی کا نام آئے

مرے اشکوں میں ثاقبؔ ہوں اجالے ہی اجالے
رسولؐ پاک کی جانب سے یہ انعام آئے

آصف ثاقب

نعتؐ

ہے شب کا نصف، سعیِ نعتِ سرور کر رہے ہیں
ورق، گلزار _ تنہائی منور کر رہے ہیں

تصور میں مواجہ کی فضا میں معتکف ہیں
بظاہر یہ ثنا پیرائی ہم گھر کر رہے ہیں

جو اُن کو دیکھ کر لکھنی ہیں _ ہوں گی کیسی نعتیں؟
وہ نعتیں، _ جن کو جنت پر مؤخر کر رہے ہیں!

شفاعت ڈھونڈتے ہیں مالکا! تیرے رضا جُو
جتن کیا کیا، ترے تسلیم پیکر کر رہے ہیں

نہیں رکھتے ہیں استحقاق لیکن مغفرت خواہ
نگاہیں جالیوں کی سمت ڈر ڈر کر رہے ہیں

نہا کر باندھتے ہیں خواب میں احرام ہر شب
وہ عمرہ اب خیالوں میں مکرر کر رہے ہیں

خیال و خواب میں ثور و حرا کے راستوں پر
سفر کس شان سے تیرے ثنا گر کر رہے ہیں

نواز اِس کو قبولیت کی رحمت ذرا نظر سے
جو دل سے سعی ہم اے بندہ پرور کر رہے ہیں

ریاضؔ آیا مدینے میں ربیع الاوّل اب کے
یہ لگتا ہے کہ جیسے حجِ اکبر کر رہے ہیں

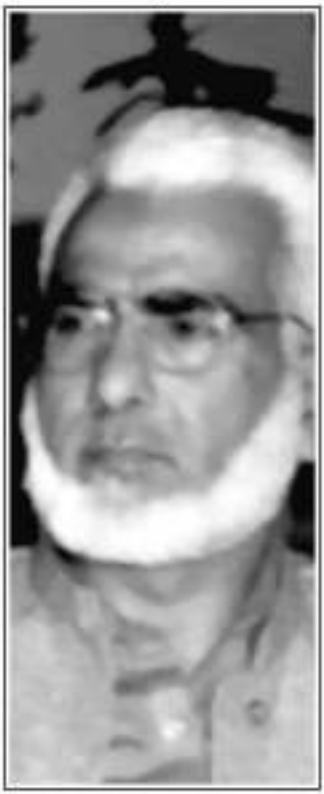

ریاض مجید

نعتؐ

لطفِ شہِ ابرارؐ کو دن رات رقم کر
طیبہ میں گزاری ہوئی ساعات رقم کر

وہ عید کا دن اور حرم کی وہ اذانیں
اے شوق! حضوری کے وہ لمحات رقم کر

ہر آن تو کر ذکر عنایاتِ نبیؐ کا
جو تجھ کو ملی آپؐ سے خیرات رقم کر

مائل بہ سخن فکر ہے اور وقتِ سحر ہے
تو خامۂ مژگاں سے مناجات رقم کر

کر پلکوں پہ یادِ مہِ فاراں سے چراغاں
اس ضو میں عقیدت کے مقالات رقم کر

بن جائیں جو تیرے لیے زادِ رہِ عقبیٰ
اے ذوقِ سخن کیش! وہ ابیات رقم کر

اے میرے قلم ! شکر بجالاتو خدا کا
تم کو جو ملی نور کی سوغات رقم کر

یٰسین قمر ڈھونڈ نیا نعت قرینہ
لکھ اسمِ نبیؐ غایتِ غایات رقم کر

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

ایک مَیں ہی تو نہیں شیدائی اے ختمِ رسلؐ
سب پہ ظاہر آپؐ کی دانائی اے ختمِ رسلؐ

صاحبِ ارض و سما بھی معترف ہے آپؐ کا
آپؐ میں گم عرش کی پہنائی اے ختمِ رسلؐ

مجھ میں کب تھا اپنے رب کو جاننے کا کچھ شعور
آپؐ سے مَیں نے یہ نعمت پائی اے ختمِ رسلؐ

آپؐ جیسی رفعتیں کس کے نصیبوں میں ہُوئیں
کس نے پائی آپؐ سی گہرائی اے ختمِ رسلؐ

ایک پرچھائیں تھی ورنہ یہ مری بزمِ خیال
آپؐ سے ہے فکر میں رعنائی اے ختمِ رسلؐ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے جہت و بے رُخ ہوں، آخر، کب تک چکراؤں
میرا گھر پہلے دن سے تھا، میرا گرد و غبار

نعتؐ

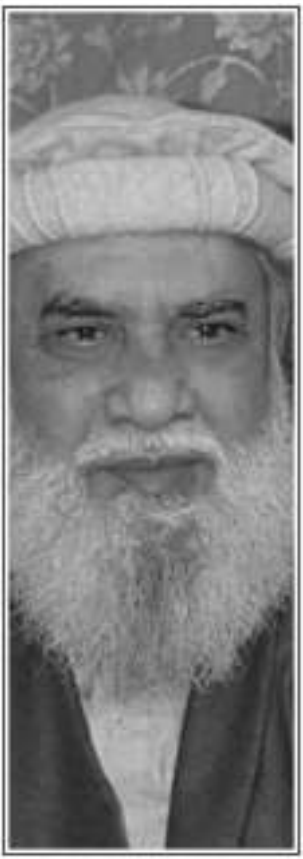

ہو مجھ کو عطا اذنِ ملاقات نبی جی
کرنا ہے مجھے آپ سے اک بات نبی جی

رہتا ہوں شب و روز میں اک خوف کی زد میں
دھڑکا سا لگا رہتا ہے دن رات نبی جی

چھٹتے ہی نہیں دل سے مرے درد کے بادل
رکتی ہی نہیں آنکھ کی برسات نبی جی

کب تک ہمیں پسنا ہے یونہی غیر کے ہاتھوں
کب تک نہیں بدلیں گے یہ حالات نبی جی

چالاک بہت ہیں تری امت کے یہ دشمن
کر جائیں نہ امت سے کوئی ہاتھ نبی جی

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دنیا ایک ہمارے پیروں کی زنجیر ہوئی
لوگ دلوں پر پاؤں دھرتے کر گئے دنیا پار

نعتؐ

کیسے کرتا رقم زمزمہ نعت کا
دل کہ پاتا نہ تھا حوصلہ نعت کا

شاملِ حال رحمت خدا کی ہوئی
مجھ پہ کھلتا گیا راستہ نعت کا

جانچنے کو خدوخالِ فکر و نظر
سامنے رکھ لیا آئنہ نعت کا

بارشِ نور پھر سے برسنے لگی
پھر سے جاری ہوا سلسلہ نعت کا

ذوقؔ اقبالؔ و شوقؔ ندیمؔ و ظفرؔ
گونجتا ہی گیا زمزمہ نعت کا

کعبؔ و حسانؔ و تائبؔ سے خالدؔ تلک
شان سے ہے رواں قافلہ نعت کا

داد طیبہ سے آئے ہملٹن تلک
کیسا دل کش ہے یہ رابطہ نعت کا

حامد یزدانی

نعتؐ

جو ہے دکھ درد میں مبتلا چل
چل نبی کے دیارالشفا چل

جیسے چلتے تھے اصحاب آقا
اُس طرح زیست کا راستہ چل

آج دل مضطرب ہے بہت ہی
کر لیں آ ذکرِ صلِ علی چل

ہوگا عرفان عشقِ محمدؐ
راہِ سنت پہ یونہی چلا چل

مصطفٰے کے طفیل المدد رب
راہ مشکل ہے کرتا دعا چل

رہبرِ وقت اک کہکشاں دے
جیسے چلتے تھے میرے شہا چل

نقشِ پا ہیں نبی کے یہاں پر
یہ مدینہ ہے بچ کر ذرا چل

ذکی طارق

نعتؐ

ذہن جب نعت کے انوار میں کھو جاتا ہے
اک اجالا میرے اطراف میں ہو جاتا ہے

واسطہ ان کا جو دیتا ہوں کسی مشکل میں
کام جو کوئی نہ ہوتا ہو وہ ہو جاتا ہے

کوئی تفریق نہیں اپنے پرائے کی وہاں
بھر کے دامن کو چلا آتا ہے جو جاتا ہے

جانے اس شہر میں جا کر میری کیا حالت ہو
ذکر جس کا میری پلکوں کو بھگو جاتا ہے

ایک جھونکا سا گزرتا ہے سرِ شامِ ثناء
خوشبوئیں میرے دل و جاں میں سمو جاتا ہے

تازہ دم ہو کے نکلتا ہوں نئی نعت لئے
بحرِ مدحت میں کوئی مجھ کو ڈبو جاتا ہے

رات ہوتی ہے بسر خلد بریں میں اس کی
نعتِ سرکار جو لکھتے ہوئے سو جاتا ہے

کوئی جا سکتا نہیں در پہ اجازت کے بغیر
اذن ملتا ہے کسی شخص کو تو جاتا ہے

شہرِ سرکار کی اک اپنی کشش ہے واللہ
پھر بھی جانے کی طلب رکھتا ہے جو جاتا ہے

کاش سرور پہ بھی برسے وہ سحاب رحمت
جرم عصیاں کی سیاہی کو جو دھو جاتا ہے

سرور حسین نقشبندی

خود کلامیاں [رباعیات]

راجا کرے راج یا ہو حاکم رانی
پرجا کا نصیب بے سرو سامانی
غرقاب کو پڑتا نہیں کچھ اس سے فرق
اک یا سَو گز ہے سر سے اونچا پانی

مطلوب عوام؟ اقتضائے آئین
یعنی صادق ہوں حکمراں اور امین
ایسے نہ کہ کذاب بھی خائن بھی ہوں
ووٹوں کی عوام کے کریں جو توہین

اپنے اپنے مفاد کا رہ کے رہین
ہر اک نے نئے سیار ڈالے بزمین
چہرے پر جھرّیاں ہیں کم عمری میں
دیکھے گر آئینے میں خود کو آئین

دھندا ہے سیاست وہ نہیں جو ناکام
ہیں آم کے آم گٹھلیوں کے بھی دام
نگلے یہ کہاں تک اپنی دُم کو سانپ آپ
بن منہ نہیں منہ سمیت جب دم ہے تمام

گرگٹ جانے فقط سیاست کا طور
یا توتا پھیر لے جو آنکھیں فی الفور
یونہی نہیں یہ مَثَل کہ ہاتھی کے دانت
کھانے کے اور ہیں دکھانے کے اور

پھل جو بھی ہو، لیں اُچک اُچکے توتے
کھائے کیوں کوئی اور ان کے ہوتے
دیتے رہیں دادِ عیش ہیں بسکہ نہال
پردادے کی کھسوٹ سے پرپوتے

کھاتے رہو ڈٹ کے مال ہے سرکاری
گزرے گی بخیر جب بھی آئی باری
باری کا بخار ہے اُتر جائے گا
انگ انگ سے جب ہوا پسینہ جاری

کرلیں کرنا ہے جو زمانے والے
دھمکی میں نہیں کسی کی آنے والے
چھوڑیں نہ شکار کا نشاں تک باقی
پکشی کو پروں سمیت کھانے والے

ایسا نہیں ہے نگل گئی اس کو زمین
جانا تھا جہاں چلا گیا با تمکین
منہ دیکھتے رہ گئے سب اک دوجے کا
ہاتھ آئی نہ کینچلی بجاتے رہے بین

سپنوں کے محل میں چاپلوسوں کے طفیل
باور کرے خود کو باگھ کا ہمسر بیل
یہ سچ بھی لگے جھوٹ ، گرا دیتا ہے
دیوار کو پاؤں چومنے والا سیل

جس کی نہیں ناک ڈالنا اس کو نکیل
بچوں کا نہیں تو کیا ہے بچوں کا کھیل
اس کوشش بے مثال کی بھی ہے مثال
کولھو میں نکالے کوئی مٹی کا تیل

لنکا ڈھانے کو دیس میں راون کے
ٹھگنے بھی ہوئے پہنچ کے گز باون کے
ڈینگی کر دے گا پھر سے ٹھگنا سب کو
آیا ہی چاہتے ہیں دن ساون کے

بھاگے چڑیا سے باز ہرنی سے شیر
سبحان اللہ کرے زبر کو جو زیر
ماشاء اللہ وہی ہو جو وہ چاہے
اس کے ہاں دیر ہے نہیں ہے اندھیر

رولے کا کھیل ہے سیاست کا کھیل
اک پاس بغیر امتحاں دوجا فیل
کر کچھ تو شرم تجھ میں ہیں دو سوراخ
طعنہ کوزے کو دے رہی ہے غلبیل*

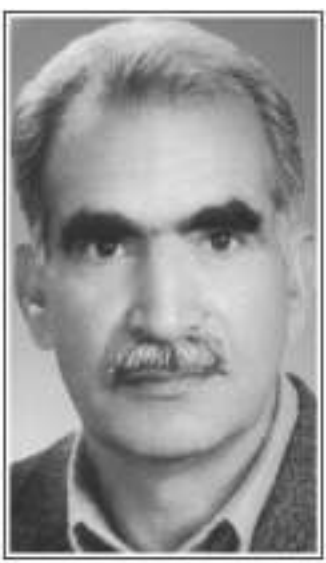

محمد ارشاد

* غلبیل (پشتو) چھلنی

رباعیات

ماحول پہ اِک نشہ سا چھا جائے گا
ہر جذبہ مرادوں کی گھڑی پائے گا
اِک لمس کی دولت مجھے مِل جائے گی
جب ہاتھ میں میرے ترا ہاتھ آئے گا

تقسیمِ محبت میں بھی کچھ غم ہی مِلے
پھر بھی یہ شکایت کہ صلے کم ہی مِلے
اے زندگی اِک بات بتانا ہمیں سچ
کیا دِل کے دُکھانے کے لیے ہم ہی مِلے

ہے کون سی ایذا جو سرِ دار نہیں
لیکن یہ اذیت بھی ہمیں بار نہیں
اقرار نہیں جرم اگر ہے کچھ اور
ہاں جرمِ محبت ہے تو اِنکار نہیں

کچھ تُو بھی اکیلا رہا کچھ ہم تنہا
ہوتا رہا تنہائی کا ماتم تنہا
دے اذنِ رسائی کہ یہ کیفیت ہے
اُٹھتے نہیں کچھ روز سے اَب غم تنہا

خاور اعجاز

قطعات

ہمت ہار کے مر گیا ہے، پر بچ سکتا تھا
کوشش کرتا تو اس کا پر بچ سکتا تھا
تیر جب آیا اس کی سمت تو اُڑتے اُڑتے
ہو کر تھوڑا نیچے اوپر بچ سکتا تھا

.....☆.....

وہ آبنوس کا ٹُنڈا یہ زعفران کی شاخ
بہت طویل ہے اس خاص داستان کی شاخ
یہ وہ دیارِ محبت ہے جس میں اَب اُلٹا
درخت کاٹتے پھرتے ہیں باغبان کی شاخ

.....☆.....

واعظ کا تو پیشہ ہے باتوں کا جال بچھانا
کہہ لینے دو جو کچھ ہے اس نے کہنا کہلانا
دوسروں کو تو ہر کوئی سمجھا سکتا ہے لیکن
سب سے مُشکل کام ہے اپنے آپ کو کچھ سمجھانا

.....☆.....

کل جو ہمراز مرے ساتھ شبِ تار میں تھا
صبح دیکھا تو وہ بیٹھا ہوا اغیار میں تھا
ہارنا گو مری قسمت میں لکھا تھا لیکن
ہاتھ کچھ اس کا بھی در پردہ مری ہار میں تھا

ہنستا رہتا ہے دوسروں پر جو
ایک دن آپ خود پہ ہنستا ہے
جال پھینکے جو دوسروں کی طرف
آخرش آپ اس میں پھنستا ہے

.....☆.....

ڈر تو ہے اختلاف کرنے میں
یعنی ہر بات صاف کرنے میں
بدلہ لینے میں پر وہ لطف کہاں
جو مزہ ہے معاف کرنے میں

انعام الحق جاوید

گیت

آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں
لاکھ چھپانا چاہو پھر بھی
اپنا آپ دکھا دیتی ہیں
آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں

سیج سجے جب من کی کیاری
اندر کھلتی ہے پھلواری
سانسیں مہک لٹا دیتی ہیں
آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں

پیار سکھا دیں انسانوں کو
شوق ہوا دے ارمانوں کو
سوئے خواب جگا دیتی ہیں
آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں

میٹھے بول حلاوت لائیں
مہر محبت جہاں سے پائیں
دامن کو پھیلا دیتی ہیں
آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں

قربت چاہے روکے دوری
نفرت ہو یا ہو مجبوری
ہر دیوار گرا دیتی ہیں
آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں

موڑیں مشکل وقت کا دھارا
کوئی رکاوٹ نہیں گوارا
تخت کو بھی ٹھکرا دیتی ہیں
آنکھیں بھید بتا دیتی ہیں

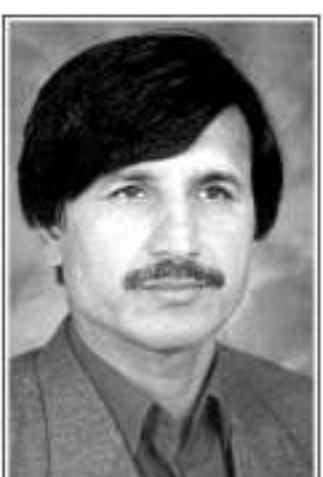

گلزار بخاری

ہائیکو

افروز رضوی

دل کی دھڑکن تم
صحرا صحرا ہے افروز
گلشن گلشن تم

اے میرے غمخوار
اک دن گر ہی جائے گی
رستے کی دیوار

بندھ جائے بندھن
تجھ کو دیکھیں تو بولیں
ہاتھوں کے کنگن

کر دیتی ہے نم
راتوں کو جب گرتی ہے
پھولوں پر شبنم

درد بیدرد

بہت سال پہلے میرے کچھ نثر پارے شائع ہوئے۔ ان اک جملہ احباب کو اور قارئین کو بہت اچھا لگا:

''ہر درد بیدرد ہوتا ہے''

اکثر دوست جب بھی ملتے یہ جملہ دھراتے تو میں عرض کرتا کہ بیدرد تھا تبھی درد ہوا نہ ہوتا تو درد ہوتا ہی کیوں کسی بھی درد کے سینے میں اپنائیت کسک رحم محبت مروت ہوتی تو یہ تکلیف نہ ہوتی مگر محبوب حقیقی سے متعلق درد کے سینے میں درد دل ہوتا ہے اسی لیے یہ درد اللہ کے قریب کرتا ہے اس کا خاصہ یہ ہے کہ یہ خاصے کی چیز ہے جب یہ دل پر وار ہوتا ہے تو تعلق کی رحمت کی محبت کی روح پر جسم و جاں پر سوچوں پر خیالات پر زبان پر آنکھوں پر اور احساسات پر بارش ہوتی ہے اس بارش میں دل کا زبان کا خیالات کا اور سوچوں کا سارا میل دھل جاتا ہے یوں اسی دنیا دار اور دنیا کے چاہنے والے میں سے ہی اللہ کا سچا دوست نکل آتا ہے جس کی نظر میں دنیا ندر کرنا سہل اور آسان ہوتا ہے اب یہ نیا انسان جو محبّ بھی ہے اور سچا عاشق بھی ہے اس درد کو اپنی ہر مشکل آسان کرنے کے لیے استعمال کرے گا چاہے وہ معاشی ہو سیاسی ہو دینی ہو دنیا وی ہو گھریلو ہو یا دفتری ہو یہی سب کا شافی علاج ہے۔

عاشقی میں محبّ خود کو یوں بھی تو سرزنش کرتا ہے کہ:

عشق جب زمزمہ پیرا ہو گا
حسن خود محو تماشا ہو گا
ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہو گا

.....

محبت ٹیس کی شکل اختیار کرے تو یہ خالصتاً اندر کا معاملہ ہوتا ہے اب یہ بات یا یہ باتیں نہ تو پیار کرنے والے ہر کسی کو بتا سکتے ہیں نہ ہی شیئر کر سکتے ہیں کہ یہ ایک خفیہ راز ہے اگر بتا دیا تو پھر راز کہاں رہا چرچا ہو گیا۔ دنیا دار لوگوں کی طرح محبت کرنے والے بھی حرصیں اور لالچی ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں درد انکے اندر کو تعمیر کرتا ہے شوق کو فروزاں کرتا ہے وارفتگی کو لہجہ عطا کرتا ہے اس کی وجہ سے

سلیمان عبداللہ ڈار

ایمان و یقین کے آگے آئی ہوئی دھند چھٹ جاتی ہے اور پیار کی راہیں کچھ اور واضح ہو جاتی ہیں اس سے اکلاپا دور ہوتا ہے اور محبوب کا قرب سہل ہوتا ہے ذھن کے پردے کھلتے ہیں اور روح کے سکون کے ساتھ ان کا امتزاج ہونے لگتا ہے جس طرح ایک دل میں دو محبتیں جگہ نہیں پکڑتیں اسی طرح ایک دل میں دو درد جمع نہیں ہو سکتے یعنی دنیا کا بھی ہو اور محبوب حقیقی کا بھی۔

بعض اوقات اک کیفیت دوسری سے بڑھ کر ہوتی ہے یعنی دو آتشہ ہوتی ہے اگر درد کے ساتھ شکر ہو تو اس کا مزہ دو آتشہ ہو جاتا ہے اصل اس کی یہ ہے کہ جس کو یہ کیفیت ملے وہ شکر کے طور پر بڑی عاجزی اور اک بے پناہ انکساری کے ساتھ انعام کرنے والے اللہ کی نعمت کا اعتراف کرے۔ یقیناً اسی اللہ جل شانہ کو مجازاً شکور کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو شکر گزاری پر جزا دیتا ہے خوش ہوتا ہے اور اپنی رضا سے نوازتا ہے اس کی کئی شکلیں ہیں معمولی سے عمل پر اللہ زیادہ عطا کرتے ہیں بار بار انکی رحمت متوجہ ہوتی ہے بندہ بار بار دور جاتا ہے وہ بار بار قریب کرتے ہیں بندہ غفلت کی طرف بھاگتا ہے ان کا کرم ہو جاتا ہے تو وہ یاد کی توفیق عطا کرتے ہیں جب درد بھی ہو اور شکر بھی تو قدرت شاکر کو شکور بننے کی توفیق عطا کرتی ہے شاکر وہ ہے جو موجود چیز یا نعمت پر شکر گزار ہو مگر شکور وہ ہے جو اس چیز پر بھی شکر ادا کرے جو نہیں ملی یعنی عطیہ ملے تو عموماً لوگ تعریف کرتے ہیں شکریہ ادا کرتے ہیں جو نہ دینے پر بھی شکر کرے وہ مشکور ہے شکور کیا کرے گا؟ مصیبت میں بھی درد میں بھی رطب اللسان رہے گا شکر ادا کرتا رہے گا۔

جیسے مندرجہ بالا سطور میں دو آتشہ کا ذکر ہوا اسی طرح سہ آتشہ بھی ہے یعنی درد ہو شکر بھی ہو اور صبر بھی ہو تو مزہ دو بالا کے بجائے سہ بالا ہو جائے گا جیسے ادبی اور شعری فنی خوبی کے لحاظ سے دو غزلہ بہتر ہوتا ہے تو سہ غزلہ بہترین ہوتا ہے۔ مصیبت کے ساتھ صبر کیا ہے؟ کہ اس حالت میں بھی بندہ اللہ کے حلوں اور سرکارِ دو عالم کے طریقوں کی پیروی میں رہے صابر کون ہے؟ جو خود کو مصیبت کا عادی بنا لے حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں صبر اور ایمان میں وہی تعلق ہے جو سر اور بدن میں ہے یہ بات ہے تو بہت مشکل کہ جس طرح عافیت پر انسان اپنی حالت میں ثابت قدم رہتا ہے اسی طرح در پر بھی استقامت ہو مگر اصلی صبر ایمان و یقین اور سچی دوستی کی پہچان بھی تو پھر اسی سے ہی ہوتی ہے آزمائش کو خندہ پیشانی سے کون قبول کرتا ہے؟ کوئی غیر نہیں بس ایسا تو صرف اپنے ہی کرتے ہیں یا کوئی اپنا ہی کر سکتا ہے تو کیوں نہ اپنے ہی بن کر رہیں کہ سرفرازی اور کامرانی اپنوں ہی کو ملتی ہے جب محبوب حقیقی نے اپنا بنا لیا تو پھر درد کہاں یاد رہتا ہے کامیابی اور کامرانی تو بہت پیچھے رہ جاتی ہے کہ جب کامیابی عطا کرنے

والا ہی مل گیا تو سب کچھ مل گیا

مصیبت پچھتاوے پر مائل کرتی ہے یہی احساس زیاں پیدا کرتی ہے یہی توبہ کے دروازے پر لے جاتی ہے ندامت پیدا کرتی ہے اپنا آپ لٹانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اللہ جل شانہ کی محبت حاصل کرنے پر مائل کرتی ہے ایسا کب ہوگا یا کس طرح ہو سکتا ہے اس کا ایک سادہ سا پیمانہ ہے جب تک لوگوں کے ہاں قدر و منزلت حاصل کرنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی رہے گی اللہ کی محبت حاصل نہیں ہوگی۔ جب اللہ کے ہاں قدر کی خواہش ہوگی تو اس کی محبت حاصل ہوگی پھر اک مقام ایسا بھی آئے گا کہ قدر و منزلت کی خواہش بھی نہ رہے گی صرف محبوب حقیقی کی یاد اسکی محبت رہ جائے گی باقی ہر طلب فنا ہو جائے گی۔

درد اک ایسی تکلیف سے پر حالت ہے جو غم پیدا کرتی ہے یعنی درد و غم حزن کا پیش خیمہ ہیں یہ ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو دل پر قابو پا کر اسے غفلت والے احوال سے نکال لیتی ہے اور اللہ کی یاد میں محو کرتی ہے حزن والا انسان اللہ کی محبت والی راہ کو تیزی سے طے کرتا ہے اللہ جل شانہ ہر درد دل رکھنے والے کو ہر غم زدہ دل کو پسند فرماتے ہیں اک روایت میں ہے کہ آنحضورؐ برابر محزون اور ہمیشہ تفکر میں رہتے تھے مروی ہے کہ غم ایک ایسا فرشتہ ہے کہ اگر کسی جگہ رہنے لگے تو یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ رہے جب دل میں غم نہ ہو درد نہ ہو تو دل ویران ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے مکین نہ ہوں تو مکان خالی ہوتا ہے کہ گھر میں رونق تو رہنے والوں ہی کی وجہ سے ہوتی ہے یہاں مجھے اک دلچسپ قصہ یاد آ گیا اک خوبصورت عالیشان کوٹھی کے مالک کی طرف سے اس کی بالائی منزل کرایہ پر دینے کا اشتہار اکثر اوقات اخبار میں آتا کوئی نہ کوئی فیملی یہ پورشن دیکھنے جاتی۔ اس گھر میں صرف ایک بوڑھا اور اسکی عمر رسیدہ بیوی رہتے تھے جو بھی فیملی گھر دیکھنے آتی یہ اس کو بہت اچھی چائے پلاتے بڑا اچھا کھانا کھلاتے ان سے گپ شپ کرتے کچھ اپنی سناتے کچھ ان کی سنتے مگر پھر توضع سے زیادہ کرایہ مانگ لیتے پھر ایک دو روز بعد کوئی نئی پارٹی آ جاتی۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ وہ رئیس لوگ تھے انہیں تو کرایہ کی ضرورت ہی نہ تھی بچے بیرون ملک کے ہو گئے اب اکلاپے کا حزن و ملال ان کے درپے آزار رہتا تھا جسے دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ سوانگ رچایا ہوا تھا درد غم حزن و ملال، رنج والم یا کوئی بھی تکلیف دہ صورت حال ہو اس میں آسانی کے لیے محبت سے درود شریف کا ذکر اک مجرب نسخہ ہے دل والوں کو اپنی ہی دنیا ہوتی ہے بعض اوقات یہ لوگ بلکہ اکثر دل والے کہتے ہیں کہ درد غم تو ساجن کے قریب کرتے ہیں میرے اک صاحب دل دوست سے اس کا پرانا کلاس فیلو پوچھا کرتا تھا جب درد ہو حزن و ملال ہو تو رب سے کیا باتیں کرتے ہو۔ وہ اک خمار آلودہ نظر

اس پر ڈالتا پھر ایسے لگتا کہ اس کی آواز کہیں دور سے آہستہ آہستہ قریب آرہی ہے وہ کہتا

''رات کے پچھلے پہر اپنے مہربان مولی سے کہتا ہوں یہ درد تیری عطا ہے میں جانتا ہوں تو نے مجھے درد کیوں دیا یہ میری اپنی کمائی ہے مجھے جو بھی آسانی خوشی اور آسائش ملی وہ تیرا کرم تھا اور ہے بھی اس درد کی وجہ سے تیری طرف رجوع ہوا تجھ سے دل ہی دل میں کچھ اور باتیں کچھ اور التجائیں کروں گا دل کو اس طرح صداقت ملے گی اور مجھے میری منزل یعنی تیری رضا حاصل ہوگی پھر میں بھی تو اسی راستے پر چلنا چاہتا ہوں جو چاہ کی راہ ہے جس کے آخری اور عظیم سرے پر مرتبے پر سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں کہ جنھیں حق تعالیٰ شانہ کا سلام آتا ہے تو عرض کیا

کیا میرا نام لے کر سلام بھیجا

تو فرمایا گیا کہ ''ہاں ابو بکر جبریل امینؑ نے ایسا ہی فرمایا ہے''

ان کی سنت صحابہ کرام والی راہ درد ہی کی راہ ہے حزن و ملال میں دعائیں ہوں تو یہ اللہ کے غصے کو ٹھنڈا کرتی ہیں رحمت کو متوجہ کرتی ہیں ناراضگی کو رضا میں بدلتی ہیں بس درد تو اک راز ہے چاہنے والے اور چاہے جانے والے کے درمیان کہ اس سے کوئی بھی نقصان نہیں ہوتا بلکہ چاہنے والے تو اس پر نازاں ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''اگر درد کو آرام آ گیا تو یاری چھوٹ جائے گی تعلق ٹوٹ جائے گا۔''

تکلیف دل ہی دل میں اللہ سے گفتگو پر مائل کرتی ہے کیفیات طاری کرتی ہے مراتب عطا کرتی ہے کہ یہ آئی بھی تو مراتب عطا کرنے والے ہی کی طرف سے ہے یہ اک ایسی جنس ہے جو اندر ہی اندر محبت کرنے والوں کے ہاں ملتی ہے وہیں پیدا ہوتی ہے یہ جنس اجناس کی منڈی میں کہاں ملتی ہے بس اس کے اسباق ازبر کرنے کے لیے قربت ضروری ہے کہ درد والی کتاب کے ہر پنے پر اک انجانا محبت بھرا سبق یاد کرنے والے کا منتظر ہوتا ہے بس درد کی کتاب دل والے مدرسے میں کوئی کھولے تو امتحان سامنے نظر آتے ہیں جن میں پاس ہونے والوں کو قرب الٰہی سے نوازا جاتا ہے کہ قرب عطا کرنے والا بھی تو وجود آپ ہے اور اسے کسی سے اجازت تو درکار ہے ہی نہیں۔

درد کا سفر بندے کے اندر کا سفر ہے محبّ کے قلب و نظر کا سفر ہے جس میں دنیا اور اس کے تعلق کو غبار راہ یا نقش کف پا کی صورت چھوڑنا ہو گا اور لغزش پا پر ندامت معافی اور توبہ کی چادر بچھا کر اسے ڈھانک دینا بھی اسی سفر کا خاصہ ہے در دکی کشتی کو دنیاوی آرزؤں کے بھنور سے نکالنے والا ہی سچا عاشق کہلوانے کا مستحق ہے اور کہلوانا بھی کیا؟ پیار کرنے والے تو کچھ بھی کہلوانا نہیں چاہتے وہ تو چاہتے ہیں بے نام رہیں بس ساجن کے نام کی مالا جپتے رہیں اسی کا نام ہو ہمارا نہ ہی کوئی نام ہو نہ ہی کوئی مقام ہو بس محبوب کی خوشی درکار ہے نام اور مقام کا کیا کرنا۔ نام اور مقام کو کیا کرنا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے

"تشبیب" کا فکری، اکتشافی و عددی مطالعہ

قصائد پر مشتمل خالد احمد کا مجموعہ تشبیب جو 1984 میں شائع ہوا، قصائد کے اس مجموعے پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر محترمہ سیدہ آیت گیلانی نے جس قدر باریک بینی اور دانش مندی سے اس مجموعہ کلام پر اظہارِ خیال کیا وہ یقینی طور پر قابل ستائش ہے۔ ہم سیدہ آیت گیلانی کے اس طویل فکری، اکتشافی اور عددی تجزیے کو قسطوں میں شائع کریں گے تاکہ ادب کے عام قاری تک بھی یہ تنقیدی جائزہ پہنچ سکے۔ [ادارہ]

(قسط # 4)

اے بحرِ برہان--- تکوینِ امکان

''دوسری سیڑھی--- پہلا قدم''

محسن نقوی نے کیا خوب کہا تھا:

ہے قریۂ ادراک منوّر تیرے دم سے
ہر ساعتِ خوش بخت جہاں نغمہ سرا ہے
ہیں نذر تیری بارگہِ ناز میں افکار!
تُو مرکزِ دلداریٔ اربابِ وفا ہے

زمزمۂ درود و سلام ازل سے جاری و ساری ہے۔ اس کی قدیم تاریخ کا سرا ڈھونڈنے نکلیں تو متلاشی راہوارِ عقل ہانپ کر گرتا ہے اور گر کر دم توڑ دیتا ہے کیونکہ وقت کے صحراؤں کو عبور کرنے کے بعد بھی سفر جُوں

سیدہ آیت گیلانی

کا ثوں باقی رہتا ہے۔ سبب اس امر کا یہ ہے کہ زمین پر سراغ تو تب ملے جب واقعہ ارضی ہو، جس کا تذکرہ عرش کے ایوانوں سے شروع ہوا ہو، جس کے ذاکر خود یزدان اور قصیدۂ اوصاف قرآن ہو، اس کے نشان تک پہنچنا آدم ؑ و اولادِ آدم ؑ کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا ہر قلم مدحتِ روحِ کون و مکاں ، رحمتِ دو جہاں ، جانِ یزداں کا شرف حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ سعادت اسی کا مقدر ہے ممدوحِ رحمٰن کی مودت جس کے ضمیر کا خاصہ اور صداقتِ قلب جوہرِ ایمان کی جبیں کا جھومر ہو۔ خوش قسمتی سے یہ سب سامان میسر ہو تو ایمان کی تازہ فضا میں قلم مصلۂ طہارت پہ سربسجود ہوتا ہے، آنکھ سے اخلاص بہتا ہے، وفا دعا گو ہوتی ہے اور اجر میں ہر اشک کے بدلے لفظ گوہرِ آبدار بے گنجینۂ تخیل کو لبریز کرتے جاتے ہیں۔ یوں خدائے حرف و صوت ذکرِ مصطفیٰ ؐ سے دامنِ روح کو مالا مال کرتا جاتا ہے--- سو:

یہ بڑے کرم کے فیصلے ہیں
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

....

بیشک حق ذات کا حق فرمان ہے:-

"وتعز من تشاءُ"

اور وہ جسے چاہے عزت دیتا ہے۔ یہاں اس عزت سے مراد فقط نیک نامی نہیں وہ سعادت ہے جو رب بندے کو اپنے محبوب کی نسبت سے عطا کرتا ہے۔ ایسے ہی خوش قسمتوں کی فہرست میں خالد احمد صاحب کا نام مثلِ بدرِ کامل جگمگاتا ہے جنھیں یہ دولت یہ عزت جھولیاں بھر بھر کر ملی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ "تشبیب" کا حرف حرف تاثیر کی چاشنی میں ڈوبا نظر آتا ہے-- شہد لہجے میں مدحت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ خاموشی سے اسرارِ توحید کی نقاب کشائی کرتے چلے جاتے ہیں کہ "اسم" کے وجود میں موجود معنی شور مچانے لگتا ہے اور اس وقت تک وہ قاری نگاہوں کو بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے جب تک وہ اس کی تہ میں اتر کر لذت و کیف کی مقررہ ساعتیں گزار نہیں لیتا۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے اسماء اور القاب ، اشارے اور کنایے ، علامات اور رموز و اسرار آپ کے دامنِ فکر سے لپٹ جاتے ہیں اور جب تک مفہوم کی گہرائی اور گیرائی سے روح سرشار نہ ہو جائے لپٹے ہی رہتے ہیں--

دوسری سیڑھی کا پہلا قدم روح کو جکڑ لیتا ہے----

====اے بحرِ برہان====

ایک ندا اور ندا میں لپٹا ہوا اسمِ توصیف----

لفظی معانی "اے دلائل کے سمندر"

حقیقی معنی اسی قدر بے انت جیسے سمندر خود بے انت --- کیا خوب اندازِ تخاطب

ہے--
بفضلِ ربی عارف آنکھ کو اس ایک ندا میں معارف کے اتنے سمندر ٹھاٹھیں مارتے نظر آتے ہیں کہ کم از کم ایک مکمل کتاب اسی اسم کی تفسیر میں لکھی جائے-- مگر کون لکھے کہ جس کے اسمِ صفت کی جاگیر لامحدود ہو بشر کی عقل میں اتنی وسعت کہاں کہ خامہ فرسائی کی جرأت کر سکے- لیکن اگر وہ چاہے تو کیا نہیں ممکن--

''برہان'' پانچ حرفوں پہ مشتمل ہے- عدد 5 حقیقتِ اسمِ ذات کی طرف اشارہ ہے-
بطور لفظ ''برہان'' کی تفصیل کچھ یوں ہے

1: برہان بمعنی ''دلیل''-

2: برہان بمعنی ''حجت''-

3: عربی زبان میں رباعی مجرد سے مشتق اسم ہے- اردو میں عربی سے ماخوذ ہے اور اصلی حالت میں بطور اسم مستعمل ہے-

(بحوالہ اردو لغت)

4: برہان دراصل ''برہ'' کا مصدر ہے جس کے معانی ہیں ''سفید ہونا''- سفید واضح کرنے والا رنگ ہے یہ ہر رنگ کو نمایاں کرتا ہے جیسے صبح کی سفیدی دن کے آغاز کا اعلانیہ ہے جو کہ ناقابلِ تردید ہے- اسی نسبت سے ہر محکم وقوی دلیل کو برہان کہا جانے لگا جو مقصود اور واضح ہونے کا سبب بنے-

5: اہلِ علم کے نزدیک برہان کا مادہ ''برہ'' ہے- ''البرہ'' کے معانی ''گورے پن کے ساتھ گداز بدن'' کے ہیں- امام راغبؒ کی لغات میں ہے کہ ''البرہان'' فعلان کے وزن پر ''بہرہ'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''سفید'' ہونے کے ہیں- اسکے معنی ایسی دلیل کے ہیں جو ہر حال میں سچی اور واضح ہو نیز کسی بھی غیر یقینی کیفیت سے پاک اور ظاہر ہو- جیسا کہ اللہ رب العزت ﷻ نے ام الکتاب کے لیے فرمایا--

برھان'' مّن ربکم

ترجمہ: ''یہ تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیل ہے-''

6: اسم نکرہ واحد ہے- جمع ''براہین'' ہے-

7: مفاہیم_ ''روشن اور واضح دلیل'' جس کے بعد ابہام یا شک کی کوئی گنجائش نہ رہے-

8: کھلی نشانی جسے ''بینہ'' بھی کہتے ہیں- اسی قبیلے کا لفظ ''مبین'' ہے-- معنی روشن، منور، واضح - جیسا کہ سورہ یٰسین میں سات مقامات پر لفظ ''مبین'' آیا ہے-

9: انبیائے کرام سے جو مافوق العادہ اعمال صادر ہوتے ہیں ان کے لیے معجزہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے متعدد حیثیات سے اس بات کو غلط قرار دیتے ہوئے ان کے لیے معجزہ کی جگہ ''آیت'' اور ''برہان'' کے لفظ استعمال کیے گئے ہیں-

(سیرۃ النبی)

یعنی لفظ برہان معجزہ کا مترادف ہے- جہاں جہاں ذاتِ نبی سے منسوب لفظ معجزہ درج

ہے وہاں بطور متبادل لفظ برہان کا استعمال درست ہے۔اس تعریف کے مطابق لفظ برہان کا ایک معنی ''معجزہ'' بھی ہے۔

==== اے بحرِ برہان ====

اس صفاتی اسم کے گلزار حقیقت کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے اس راز سے پردہ اٹھانا لازم ہے کہ یہ الفاظ کی جادوگری نہیں بلکہ معارف کی ضو ہے-- جیسا کہ صاحبانِ علم واقف ہیں کہ دستور دنیا یہ رہا ہے کہ بادشاہانِ وقت کے منظورِ نظر بننے کے اور اجر میں مالی منفعت حاصل کرنے کے لیے قصائد لکھے جاتے تھے۔اس سے ایک فکر جو اس صنف کے بارے میں عام ہوئی اُس کے مطابق قصیدے کو مبالغہ آرائی کا گرم بازار اور خوشامد کی بستی کہا گیا-- قصائد میں بیان کردہ اوصاف کی صداقت کو مشکوک سمجھتے ہوئے متذکرہ شخصیت کو بھی مشکوک متصور کیا جاتا رہا۔ مگر اذہانِ عالی خوب واقف ہیں کہ ہر تصویر دو رُخی ہوتی ہے-- قصیدے کا بھی یہی حال ہے اگر اس کو ارضی کینوس پر پھیلا کر دیکھا جائے تو عیوب و نقائص کے دفتر کھولے جاسکتے ہیں لیکن اگر کینوس عرشی ہو اور تصویر نوری تو معاملہ برعکس ہوگا-- مطلوب اس تمہید سے یہ کہ قصیدے کی صحت کو پرکھنے کے لیے صاحبِ قصیدہ ذات کو پہلے دیکھنا ہوگا۔اگر ذات میں کہیں نقص عیب ہوا تو قصیدے میں عیب ممکن ہوسکتا ہے لیکن اگر ذات اتنی سچی ہو کہ قرآن اتباع کے لیے پکار پکار کر صداقت کی گواہی دیتے ہوئے کہے کہ ''کونو مع صادقین'' (یعنی ہو جاؤ سچوں کے ساتھ)---- تو یقیناً یہ ثبوت ہے کہ قصیدہ گو بھی سچا ہے اور قصیدہ بھی سچا ہے۔چونکہ ''تشبیب'' کا محور و مرکز وہ ذات ہے جس کا قصیدہ ''القرآن'' اور قصیدہ خوان ''الرحمٰن'' ہے اس لیے اس کا ہر حرف طلسمِ معانی سے بھرپور خزانہ ہے۔یہ فقط الفاظ کی نگینہ کاری ہی نہیں بلکہ اسرار و علوم کا مخزن بھی ہے۔یہ فقط شاعر کا تخیل اور طرزِ تخاطب ہی نہیں بلکہ ان حقیقتوں کی نقاب کشائی بھی ہے جو فضائل کا سمندر بنیں، آپؐ کی نعلین مبارک کا بوسہ لے کر مکمل تازگی، شگفتگی اور رعنائی سے ازل تا ابد قائم دائم ہیں۔

==== طلسمِ حروف ====

علم الحروف کے کامل علماء اس راز کے شاہد ہیں کہ حروف کی ایک طلسماتی دنیا ہے جہاں ہر حرف اپنے اپنے عالم میں اپنی منفرد حیثیت، صورت، مقام اور خصائص کے ساتھ مقیم ہے۔حجت کے لیے مخصوص الفاظ میں ہر لفظ میں جو حروف ظاہر ہوتے ہیں وہ صرف ظاہری صورت کے ساتھ موجود نہیں ہوتے بلکہ اپنی تجلی اور اسرار و رموز کے رنگ بھی بکھیرتے ہیں اور نہ صرف اپنے خصائص کی تجلی دکھاتے ہیں بلکہ حجت کے

اوصاف کے بھی امین ہوتے ہیں۔ برہان پانچ حرفی لفظ ہے یہ اسمِ صفت ہے جس کا ابتدائی حرف ''با'' ہے۔۔ اس اسم میں با فقط ابتدائیہ نہیں بلکہ اپنی مکمل تجلی کے ساتھ موجود ہے۔ با۔۔ ترتیب میں دوسرا حرف ہے۔۔۔ پہلا حرف الف ہے۔ با کو سمجھنے کے لیے الف کا عرفان ضروری ہے۔ الف کے لیے علماء حق کا بیان ہے کہ الف۔۔ امتداد نقطہ کا نام ہے الف کے لیے اس دنیا سے 13 لاکھ زیادہ بڑے عالم چاہییں یعنی الف کا عالم اس دنیا سے اربوں گنا بڑا ہے۔ الف حرف کبریائی ہے یہ ''اللہ'' کے لیے ہے کیونکہ

''الف۔۔۔ اول مخترع من الحروف،

سائر الحروف محتاجون الیہ۔''

الف۔۔۔ حروف میں پہلا اختراع کیا ہوا حرف ہے۔ ہر حرف اس کا محتاج ہے یہ ہر حرف سے غنی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی عدد نہیں بن سکتا جب تک واحد نہ ہو۔۔ اور واحد کسی کا محتاج نہیں ہوتا''

جس نے عرش کے پہلے پائے کے بیرونی سطح کے عالی کا نام بھی ''الف'' ہے۔ اور الف۔۔ با میں پوشیدہ ہے۔۔۔

ابنِ عربیؒ سے کون نہیں واقف۔ تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال پہلے اہلسنت کے ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں آپ علم الحروف میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ حقیقتِ با پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''الباء الانواع ثلاثۃ شکل الباء و نقطتھا

وحرکتھا شکل الباء ملکوتہ و نقطتھا

والحرکۃ شھادتہ، وملکہ والالف

المحذوفۃ التی حقیقۃ القائم بھا

الکل مختفیۃ بھار رحمتہ منہ

فی النقطۃ التی ھی تحت الباء''

وہ کہتے ہیں ''ب'' کی تین قسمیں ہیں۔ حرف ایک ہے۔ قسمیں تین ہیں۔ ب کی حرکت۔۔۔ ب کا نقطہ۔۔۔ ب کی شکل نحو کا یہ قانون ہے کہ

الساکن اذا حرک حرک بالکسر

ساکن حرف کو جب حرکت دی جاتی ہے تو زیر (ِ) سے دی جاتی ہے۔

وبالوالدین احسانا۔۔۔ جب تک زیر نہ ہو گی نہ تعلق ظاہر ہو گا اور نہ ہی حرف حرکت کر کے تمسک کرے گا۔

(یہاں ایک اور عمومی غلط فہمی کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ غلط العوام کہوں یا علم کی بدقسمتی کہ کتابوں تک میں درج ہے کہ قرآن پاک پر اعراب حجاج یوسف نے لگوائے۔ اس فاسق و فاجر حکمران نے جب بیت اللہ کا احترام نہیں کیا تو بعید از عقل بات ہے کہ کتاب اللہ کا خیال کرے۔ درحقیقت یہ کارِ خیر حضرت علیؓ کے حکم سے آپؓ کے شاگرد ابوالاسود دوئلی نے لگوائے۔ چونکہ زمانہ حجاج کا تھا تو تاریخ کے بکے ہوئے مورخ نے نام حجاج کا لکھا)

علمائے نحو --- رفع --- بھی پیش کو کہتے ہیں --- ضمہ -- بھی۔
نصب -- بھی زبر ہے اور -- فتح --- بھی۔
اسی طرح زیر کو -- کسرہ -- بھی کہتے ہیں اور -- جر -- بھی۔ تو نحو کے قانون کے مطابق زیر یا کسرہ سے لفظ کو حرکت دی جاتی ہے --- با --- کے سکون کا تقاضا بھی کسرہ ہے اور حرکت کی وجہ بھی --- جب تک کسرہ نہ لگے دنیا کا بڑے سے بڑا عالم اور مجتہد اسے پڑھ ہی نہیں سکتا۔ یعنی -- با -- با ہے تو کسرہ کی وجہ سے -- اور مقام با یہ ہے کہ کتب حدیث شاھد ہیں کہ رسولؐ پاک کی حدیث مبارکہ ہے کہ

''الباء حجاب الرب لو ارتفعت الباء لشھد الناس ربھم''۔

سچے رسولؐ نے فرمایا:

''-- با -- رب کا پردہ ہے یہ ہٹ جائے تو اللہ سامنے نظر آئے ---''

اس حدیث نے راز کھولا کہ -- با -- رب کا پردہ ہے --- اور ظاہر کیا کہ کیوں الف چھپا ہے با میں، جو حرف کبریائی ہے۔ عقلیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے محشر تک تلوے گھسا لیتیں سمجھ ہی نہیں آ سکتا تھا کہ اس بے بدل ذات نے خود کو ''کنت کنزاً مخفیاً --- میں چھپا ہوا خزانہ تھا'' --- کہا تھا تو وہ کس اوٹ میں چھپا تھا۔

با میں چھپی ہے توحید اور با سے برہان ہیں مصطفیٰؐ -- جو توحید کا مظہر ہیں۔ سبحان اللہ ---

دعائے صباح میں ایک کلمہ ہے کہ

یا من دل علی ذاتہ بذاتہ ---

''اے وہ ذات جس کی ذات پر دلیل ہے وہ ذات ---''

یا پھر یوں کہ

''اے وہ ذات جس نے اپنی ذات پر دلیل دی اپنی ذات کے ساتھ ---''

دعائے صباح کا یہ جملہ جو زبان معصوم امام علی ع کی زبان اطہر سے ادا ہوا جس طرح اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے وہ بلاشبہ لاریب ہے -- دنیا میں بسے ہوئے انسانوں کی ذوات ہاشمی -- قریشی --- بلوچ - اعوان --- بٹ وغیرہ ہیں مگر کونین قربان اس ہستی پر جس کی ذات خدا کی ذات ہے --- کیا خوبصورت راز ہے کہ نہ صرف آقائے دوجہاں مقاصد الٰہیہ کے ترجمان ہیں بلکہ حقیقت ذات یزداں کے بھی ترجمان ہیں ---

یہی با ہے جسے حروف میں یہ درجہ حاصل کہ اس میں قرآن قیام کرتا ہے۔ اس حرف کا بلاشبہ قرآن کا مسکن کہہ سکتے ہیں۔

حدیث رسولؐ عربی ہے کہ ---

''سورہ یٰسین قرآن کا دل ہے۔ جو کچھ قرآن میں ہے وہ تمام معارف سورہ یٰسین میں ہیں۔ جو کچھ سورہ یٰسین میں ہے وہ سورہ فاتحہ میں ہے۔ جو کچھ سورہ فاتحہ میں ہے وہ اکیلی آیت

تسمیہ یعنی بسم میں ہے۔ اور جو کچھ بسم میں ہے وہ صرف تسمیہ کے حرف آغاز یعنی با میں ہے اور جو کچھ با میں ہے وہ سب کا سب اس نقطے میں ہے جو با کے نیچے ہے۔۔"

سبحان اللہ۔۔۔ ایک حرف ہے مگر کل قرآن کا گھر۔۔ حرف بھی کہاں ایک نقطہ ہے جس میں کل قرآن رہتا ہے۔ قرآن ہے کلام اللہ تو جہاں قرآن رہتا ہے وہاں خالق و مالکِ قرآن۔

برہان بھی ب سے بشیر بھی ب سے۔۔۔۔

حدیث سے حدیث کی تائید ہوتی ہے تو روح گلاب کی طرح کھل جاتی ہے جب اسرار سے پردہ اٹھتا ہے تو روح کائنات پہ لرزہ طاری ہوتا ہے۔۔ راہوارِ عقل منہ کے بل گرتا ہے اور قلم کبھی نہ اٹھانے کے لیے سجدے میں سر رکھ دیتا ہے۔۔

جس کے اسم صفت کا نکتہ قرآن کا گھر، رحمٰن ﷺ کا مسکن ہے اس ممدوح رب دو جہاں کی مدحت و ثنا کائنات لکھے بھی تو کس طرح۔۔۔۔ میرا زمزم زمزم درود پڑھتا ہے۔۔۔

اللھم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجھم۔

====قرآن اور برہان====

دنیا کو "ورفعنا لک ذکرک" کے تاجدار کا رتبہ بتانے اور عظمت سمجھانے کے لیے کلام الٰہی میں خدا ارشاد فرما رہا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (۱۸۶)

(ترجمہ) اے لوگو!! تمھارے پاس پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل آ چکی اور اس نے تم پر نازل کیا روشن نور۔

تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس آیہ مبارکہ میں اللہ رب العالمین نے تمام گروہ انسانی (چاہے وہ مشرک ہوں، منکر ہوں، ملحد ہوں یا کافر) کے ہدایت کے لیا تمام حجت کرتے ہوئے اپنے پیغمبر نبی آخر الزماں، وجہ وجود کون و مکاں کو آخری رسولؐ بنا کر بھیجا اس رُو سے آپؐ اللہ کے وجود، قدرت اور علم کا مجسم، حتمی اور واضح ثبوت بن کر تشریف لائے۔۔ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خدا کی ذات جس توحید کی دعوے دار ہے اس دعوے کی دلیل رسولؐ کی ذات ہے۔۔

خدا وحدہ لا شریک ہے۔۔۔ قرآن نے بتایا۔۔ نبیؐ نے سمجھایا اور منوایا۔ قرآن میں رحمٰن نے دعویٰ کیا۔۔ زمانے نے دلیل مانگی تو رسولؐ سامنے آئے کیونکہ یہی دستور ہے کہ دعویٰ بصورت لفظ خاموش رہتا ہے۔۔ دلیل نطق کھولتی ہے۔۔ دلیل ہی بولتی ہے۔۔

دعویٰ کرنے والا چودہ صدیوں سے خاموش ہے۔ دلیل چودہ صدیوں سے محوِ گفتگو ہے۔۔۔

(جاری ہے)

نوٹ:۔ "طلسمِ حروف" کے لیے "سلطان العلماء علامہ غضنفر عباس تونسوی ھاشمی" کے مجموعہ تقاریر "حروف مقطعات" سے استفادہ کیا گیا۔

آخری تنکا

بلاوجہ کثرتِ خورد و نوش کا شوق اور آرام رنگ لایا اور بڑی خانزادی کو دل کے مرض نے آلیا اور جو جان لیوا ثابت ہوا اور بڑی خانزادی اپنے اکلوتے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی حسرت لیے چل بسیں۔

پتہ نہیں جہاں رزق زیادہ ہو وہاں اولاد کم ہوتی ہے دو ہی تو بچے تھے بڑی خانزادی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اب اتنے بڑے تام جھام کے ساتھ چھوٹی خانزادی اکیلی رہ گئیں سارا کاروبار چلانے کو مگر یہ انھیں بوجھ نہ لگا۔ نوکر نوکرانی کی فوج کے ساتھ احکامات جاری کرتے رہنا مہنگا سودا انہیں تھا خود تو نظر رکھتی ہی نہیں۔ نگرانوں پر نگران رکھے ہوئے تھے۔ مالک کا ہاتھ کھلا ہو تو اونچ نیچ تو نوکر سہہ ہی لیتے ہیں اور خانزادی کا ہاتھ کھلا تھا۔

اب خانزادے کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی سوائے خانزادی کے۔ اُس کے ذہن میں اپنی بھابی کے لیے ایک خاص تصور تھا۔ گورا رنگ، لانبے بال نازک اور پھرتیلا سراپا اور بہت خوبصورت نین نقش۔ اب ایسی آرڈر پر تیار کی ہوئی لڑکی کہاں سے آئے وہ اکثر تقریبات کی مہمان خصوصی بننا اس لیے قبول کر لیتی تھی کہ اس طرح لڑکیوں کو نہ صرف قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا بلکہ چال ڈھال اور بول چال سے بھی واقف ہو جائیں گی مگر ابھی تک گوہر مقصود مل نہیں پایا۔ اُنھیں کوئی لڑکی پسند آتی اور ساتھ ہی اُس کی کوئی نہ کوئی خامی بھی نظر میں آ جاتی۔ یونہی دن گزرتے گئے اور جب بھائی کی توند نکلنے اور بال کم ہونے لگے تو ان کی تلاش تیز تر ہو گئی اور انھیں گوہرِ مقصود مل ہی گیا۔ ایک کالج کے فنکشن میں اُس لڑکی نے ایک مقامی رقص پیش کیا۔ بڑی بڑی آنکھیں معصوم چہرہ ترشے ترشائے نین نقش مورنی سی چال اور بڑی میٹھی دلکش آواز۔ پتہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو اُنہی کے محلے کی باسی ہے۔ اور خانزادی سے مزید صبر نہ ہوا اور ایک دن وہ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے بہ نفس نفیس اُن کے گھر جا دھمکیں گھر والوں کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ خانزادی اور اُن غریبوں کے ہاں۔ مگر اس میں بھی خانزادی کی چالاکی پوشیدہ تھی کہ صحیح معنوں

فرحت پروین

میں اصل حالات اور لڑکی کی بول چال اور چال ڈھال دیکھ لیں۔ معمولی سا صاف ستھرا تھا۔ ملیحہ نے بڑے سلیقے سے چائے پیش کی اور آواز اور گفتگو کا انداز اتنا مہذب اور دلنشین تھا کہ وہ سو جان سے فدا ہو گئیں ایسے ایسے ہیرے ان غریبوں کے ہاں کیسے پیدا ہوتے ہیں اور پھر خانزادی نے فوراً ہی مہ جبیں کا ہاتھ مانگ لیا۔ بس بہن جی اب مہ جبیں میری ہوئی میں نے کوئی بات نہیں سننی۔ ”بیٹی اس کے والد سے تو مشورہ کرنے دیں۔ آپ بھی یہیں ہیں ہم بھی یہیں ہیں۔ جو قسمت میں ہو گا دیکھ لیں گے۔“ مہ جبیں کی والدہ نے کہا میں کچھ نہیں جانتی بہن جی۔ بڑے برسوں کی تلاش کے بعد ملی ہے مہ جبیں۔ آپ خود ہی مشورہ کر لینا اپنے شوہر سے۔ ہماری طرف سے کوئی مطالبہ یا شرط شرائط نہیں سارے محلے میں ہائے ہائے پڑ گئی کہ خانزادی بذات خود ایک اکیلی بغیر اطلاع کے مہ جبیں کا ہاتھ مانگنے پہنچ گئی ہے۔ مہ جبیں کی پڑوسن سہیلی نے حسد سے جلتے بھنتے ہوئے ماں سے کہا کہ آخر ایسا کیا ہے مہ جبیں میں جو اس میں نہیں۔ اب ماں اپنی بیٹی کا دل تو نہیں توڑ سکتی تھی کہ وہ صورت میں مہ جبیں کے پاسنگ بھی نہیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی وہ کالج کی پڑھی ہوئی ہے نا۔ اور بیٹی بات سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے چپ ہو گئی۔

دوسرے دن چڑھاوا آ گیا تو نوکرانیوں کی فوج ظفر موج سجے سجائے خوان لے کر پہنچ گئیں اور سب مہ جبیں کی قسمت پر رشک کرنے لگیں۔

دلدار خان بھی خوش شکل اور مثالی عادات کا تھا بس بہن نے ذرا دلہن ڈھونڈنے میں دیر لگا دی تھی تو ذرا توند نکل آئی تھی اور بال چھدرے ہو گئے تھے۔ ایک ہی ماہ کے اندر مہ جبیں دلہن بن کر حویلی میں جا اتری۔ حسین ایسی کہ نظر ہٹائے نہ ہٹتی۔

دلدار خان اپنے علاقے کے لحاظ سے مثالی شخصیت تھا۔ دوستوں کا دوست وقت پر کام آنے والا مگر بیوی کے نیچے لگنے والا نہیں اُس کو فاصلے سے رکھنے اور زیادہ پرواہ کرنے والا نہیں کہ یہی معیار تھا دیہات میں ایک اچھا مرد ہونے کا۔

سو اُس نے مہ جبیں کی خاص پرواہ نہ کی جسمانی تعلق قائم رکھا۔ اور کم عمر شوخ و شنگ لڑکی بجھ کر رہ گئی۔ اُدھر خانزادی پورے راج پاٹ پر قابض تھی اور مہ جبیں ایک فالتو پُرزے کی طرح کہیں نہ کہیں پڑی رہتی اب زور اس بات پر تھا کہ وہ بچے پیدا کرے اور خانزادی اپنے خوبصورت بھتیجوں کو گودوں میں کھلائے۔ وہ دن بھی آخر آ ہی گیا۔

اور اب تو نظام ہی بدل گیا۔ پھوپھی نے ایک آیا رکھ لی اور خود بھتیجے کو لے کر بیٹھ گئی اور مہ جبیں کو کہا گیا کہ کب تک مہمان بنی رہے گی اپنا گھر سنبھالے۔ وہ اتنے کام کی کہاں عادی تھی۔ یہ سب اُس سے نہ سنبھلا تو طعنے ملنے لگے۔ اُس کی صورت بجھ گئی صحت خراب ہو گئی مگر فرائض بڑھتے گئے کم نہ ہوئے اور پھر ایسا

ہوا کہ دلدار خان بیمار پڑ گیا۔ بہن نے باہر مردانے میں رکھنے کے بجائے گھر کے ایک پورشن میں رکھ لیا۔ حکیم ڈاکٹر آیا گیا وہیں ہوتا۔ شام کو بہن بھی جا بیٹھی، اور مہ جبیں، مہمانوں اور گھر کے کاموں میں خود کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔

دلدار خان نے یہ روگ کسی طوائف سے لگوالایا تھا اور جو قابلِ علاج نہ تھا۔ لاکھ مہ جبیں سے چھپایا گیا مگر ایسی باتیں کہیں چھپتی ہیں۔ مہ جبیں کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ گئی مگر وہ تو عرصے سے گونگی بہری ہو چکی تھی۔

ایک روز پھر خانزادی نے کہا کہ تمھیں توفیق نہیں ہوتی کہ دو گھڑی میاں کے پاس بھی جا بیٹھو کہ اُس کا خیال بیماری سے ہٹے کچھ دل بہلے۔

تو وہ بولی کہ آپ تو ہمہ وقت اپنے بھائی کے پاس ہوتی ہیں۔ میں نے گھر بھی دیکھنا ہوتا ہے اور بچے بھی، تو میرے پاس وقت کہاں سے آئے۔ مجھے تو اپنا ہوش نہیں خانزادی چونکی۔ اچھا! تو تو بھری پڑی ہے کہ ہم نے تمھیں ظلم کی چکی میں پیس ڈالا۔ اپنی اوقات بھول گئی۔ دو ٹکے کے کچے گھر میں رہتی تھی۔ اس حویلی سے تو کچے گھر میں ہی ٹھیک تھی اپنی زندگی تو آرام سے جیتی۔

بہت زبان لگ گئی۔ خانزادی مشتعل ہو گئی مگر مہ جبین نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اب خانزادی کو آگ لگی کہ بھائی سے شکایت کر کے اسے بے عزت کراتی ہوں۔ بھائی کے کان بھرنے کے بعد اُس نے اسے کہا ٹھہرو میں بھابی کو بھیجتی ہوں۔ ذرا اُسے اُس کی اوقات بتاؤ۔ بہت اُڑنے لگی ہے۔ اُس نے یہ نہ دیکھا کہ بھائی کی حالت کافی خراب ہے۔

آ کر بولی۔ ''بھائی تجھے بلا رہا ہے۔ کبھی اُس کے پاس بھی جا بیٹھا کر۔''

اوّل تو مجھے فرصت نہیں ہوتی پھر اُن کے دوست یا رشتہ دار اور ڈاکٹر حکیم بیٹھے ہوتے ہیں۔ آپ کے تو سب اپنے ہیں۔ میں کیسے گھسوں اِن سب میں۔

اپنی اوقات میں رہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ جا اِس وقت وہ اکیلا بیٹھا ہے۔ تھکن سے لڑکھڑاتی، یہ اُس حصے میں گئی جہاں دلدار خان قیام پزیر تھا۔

وہ اسے دیکھ کر کمزوری آواز میں بولا۔ میرا کچھ پتہ نہیں کب اگلا سانس آئے نہ آئے، تو مجھ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لے۔

معافی مانگوں۔ میں۔ تم سے۔ مجھے تم سے نفرت تھی اور نفرت ہے۔

دلدار خان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی۔ کیا کہا؟

یہی کہ مجھے تم سے نفرت ہے اور یہ وہ آخری تنکا ہے جو اونٹ کی پیٹھ توڑ دیتا ہے۔ دلدار خان کے منہ سے دھاڑ جیسی آواز نکلی اور اُس کا دل ساکت ہو گیا۔

دھاڑ کو سن کر خانزادی بھاگتی ہوئی آئی اور بھائی کی ڈھلکتی ہوئی گردن سنبھالنے کے بجائے مہ جبیں کے پیٹھ پر زور سے دو ہتڑ مارا۔ کیا کہا ہے تو نے کم بخت ابھی تو میں بھلا چنگا چھوڑ گئی تھی اور مہ جبیں جیسے مدہوشی میں مڑی اور بیہوش ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

’بنتِ خلیفہ‘

ذیشان بھائی کے بیٹے (میرے بھتیجے) کی سالگرہ انتظار کیا جانے والا فنکشن ہوتا تھا۔ ذیشان بھائی اور اریان بھائی کے مشترکہ خوبصورت گھر کا لان اتنا بڑا تھا کہ بڑی سے بڑی محفل بخوبی سجائی جا سکتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیسے اس کی قلمی تصویر کھینچوں۔

ڈراموں میں روساء کے محلات جیسی بلڈنگ کے سامنے ایک بڑا لان جس کو جمع کے نشان (+) جیسی روشوں نے چار حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ اب اُن میں سے ایک لان ٹینس اینڈ بیڈمنٹن کا میدان تھا، دوسرا پھولوں پودوں مرسبز بیلوں سے مزین جس میں لکڑی کے نرم دیدہ زیب بینچ، تنکوں چھڑیوں سے بنے موڑھے تھے موسم کا لطف لینے کے لیے نشست کا اہتمام تھا۔ چوتھے لان کا دروازہ سائیڈ روڈ پہ کھلتا تھا یہ عموماً مرد احباب کے آنے جانے بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتا سبزہ اور پھول اس میں بھی کم نہ تھے۔

فطرت سے میری وابستگی کا اندازہ آپ کو میری اس منظر نگاری سے ہو چکا ہوگا۔ دو بھائی اور دو بہنوں میں میرا آخری نمبر تھا۔ والدین حیات نہ تھے۔ میں لاہور میں جاب کرتی تھی اور ویمن ہاسٹل میں رہتی تھی۔ بھائیوں کے گھر خاص موقعوں پہ جانا ہوتا۔ اُن تینوں کے گھر والدین بسا گئے تھے تینوں مجھ سے پیار کرتے تھے مگر مجھے بڑا نہ ہونے دیتے تھے۔

اُس روز بھتیجے فخرے ذیشان کی پانچویں سالگرہ کے جشن میں چاروں لان منور و مزین تھے۔ ٹینس کی میز اور بیڈمنٹن کا نٹ ہٹا کر دونوں متوازی لان میں اضافی کرسیاں صوفے لگوا دیے گئے تھے۔ بچے جھولوں والے حصّے میں مگن تھے۔ بھابیوں کی بہنیں، بھابیاں، میری بہن اروما اور اُس کے سُسرال الغرض فیملی کی خواتین کا بچوں والے لان میں رنگ و بو اور باتوں کی

دردانہ نوشین خان

خوشبو تھی۔ پار روش والے لان میں مردوں کے قہقہے تھے۔ دروازے والے لان میں آج ڈرائیورز، ملازمین کا حلقہ تھا۔ قسم قسم کے سامان خورد و نوش کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ ہائی ٹی تھی کیک کٹنے کے بعد ہلکی پھلکی گیمز ہوئی۔ اصل مزہ تو محفل موسیقی میں آتا تھا۔ جب تیز لائٹس بند کر کے دھیمی نیلگوں روشنیاں باقی رہتی۔ مردانہ زنانہ کرسیوں کا رُخ سٹیج کی جانب ہو جاتا۔ سُر اور ساز کا سحر طاری ہو جاتا۔ گلوکار اچھا تھا اُس کی آواز گہری اور گھمبیر تھی۔ سدا بہار نغمات اور غزلیات کا انتخاب اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کر رہا تھا۔

نہ تم ہمیں جانو
نہ ہم تمھیں جانیں
مگر لگتا ہے کچھ ایسا
میرا ہمدم مل گیا

میں گانے کے بولوں پہ آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔ ہلکی ہلکی تالیوں سے سنگیت کا ساتھ دے رہی تھی۔

''دلیلیٰ'' کسی نے قریب سے پکارا۔

''جی بھائی'' میں نے آنکھیں کھولی۔ میرے آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ کس نے پکارا تھا؟ آواز مردانہ تھی۔ بھائی لوگ تو سب دوسری طرف موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میرے سامنے ملازمین والے لان سے کوئی دراز قامت شہزادے جیسی آن بان والا شخص روش پر آ رہا تھا۔ اُس پہ نظر پڑی تو بچ یہ ہے کہ ہٹ نہ پائی۔ غیر معمولی خوبرو، پُروقار پُرتمکنت، بے داغ، بے شکن، سفید لباس، شاہانہ بے نیازی، بس ایک پل اُس کی سرسری نگاہ مجھ پر پڑی پر اُس نے مطلق توجہ نہ دی۔ مردانہ سائیڈ میں جا کر گم ہو گیا۔ میری نظروں نے اُس کا پیچھا کیا وہ مجھے کسی بھائی سے ملتا سلام کرتا دکھائی نہ دیا جانے کس گوشے میں جا کے بیٹھ رہا تھا۔

اچھا..... ہوگا کوئی.....

محفل موسیقی کے دوران کاجو بادام ڈرائی فروٹ، آئسکریم، کشمیری چائے کے دور چلتے رہے۔ وہ کسی شوخی شرارت اُٹھک بیٹھک میں دکھائی نہ دیا اتنا بھی ہجوم نہ تھا۔ کہاں گیا تھا وہ؟ اچھا کہیں ہوگا۔

میرے اندر یہی چلتا رہا۔

تقریب ختم ہو گئی۔ ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہو گئے۔ گھر والوں میں سے اکثر نے اندر کمروں کی راہ لی۔ کچھ بچے ابھی تک لان میں تھے۔ میں اپنا چائے کا کپ لے کر ادھر ادھر ٹہلتی سٹیج والے لان (مردانہ لان) میں جا پہنچی۔ مجھے تقریبات کے بعد کا سماں حقیقت آشنا لگتا ہے۔ آدھا چاند بلند کھجوروں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ ہنگامہ خاموشی میں بدل گیا تھا۔ فالتو

روشنیاں آف کر دی گئی تھیں۔ دوسرے لان سے کافی روشنی آ رہی تھی ملازم لڑکا بکھرے ہوئے ڈسپوزیبل کپ، گلاس، پلیٹیں، چن رہا تھا۔ سبزے کی مہک، سگرٹ کی باس، چوکلیٹ کی خوشبو، زندگی فضاؤں میں رچی تھی۔ سماعتوں میں تازہ سُنی غزلوں کے بول تھے۔

میں سٹیج پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سرسری دیکھتے احساس ہوا اُدھر داہنے طرف کے صوفوں میں کوئی بیٹھا تھا۔ شاید وہ اپنے موبائل پہ جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنی گاڑی منگوا رہا ہو۔ اندازے لگانا میری عادت رہی ہے۔ میری جانب اُس کا پہلو تھا سیاہ چمکدار بال، سفید بے داغ دودھیا آستین......

ارے یہ تو وہی تھا۔

میں اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ دیکھتا ہی نہ تھا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے اُسے معلوم نہ ہو اُس سے چند گز کے فاصلے پہ کوئی بیٹھا ہے...... بلکہ لڑکی بیٹھی ہے۔ وہ زیرِ لب بہت آہستہ گنگنا رہا تھا۔

نہ تم ہمیں جانو
نہ ہم تمھیں جانیں
مگر لگتا ہے کچھ ایسا

یکدم اُس نے سر اٹھایا میری طرف دیکھا جیسے اُسے پتا ہو کہ اُسے دیکھا جا رہا ہے سوچا تو یہ تھا کہ جب یہ دیکھے گا میں اَن دیکھا کروں گی مگر نظر بے اختیار ہو گئی...... بڑی بڑی سرمگیں گہری کالی آنکھیں (عام آنکھیں نہ تھیں) میں نے اپنے اندر سے تجسس کو مہذب اظہار دیا۔

"کون ہیں آپ؟"

"ظا...... فر"

"میں ذیشان بھائی کی بہن ہوں" میں معتبر تعارف کرانا چاہتی تھی

"لیلیٰ......" اُس نے میرا نام بول دیا (یعنی بھائی کا قریب کا دوست ہو گا) اس اثنا میں وہ ایک بار اخلاقاً بھی نہیں مسکرایا تھا۔ پھر وہ شانِ بے نیازی سے اُٹھا اس کے ہاتھ میں کوئی موبائل نہ تھا۔ وہ ایسے چلتا تھا جیسے چڑھائی چڑھ رہا ہو۔ روش پہ جاتے جاتے اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا...... رُکا، کہا۔

"چلنا ہے......"

پہلے لگا مجھ سے پوچھ رہا ہے "چلنا ہے؟" پھر لگا وہ بتا رہا ہے مجھے چلنا ہے

وہ بہر حال عجیب تھا......

"بھائی بتایئے ناں، آپ مجھے ستا رہے ہیں" بستر پر آلتی پالتی مار کے میں دونوں بھائیوں کے درمیان بیٹھی تھی اریان بھائی کا ایک سالہ منا میری گود میں تھا۔

"میں تو یہ نام پہلی بار سُن رہا ہوں...... ظافر"

"اس سے ملتا جلتا کوئی نام بھی ہمارے دوستوں میں نہیں۔" اریان بھائی نے میری حیرت میں مزید اضافہ کیا۔

''شاید کسی کے ساتھ آیا ہو'' بھابی نے ننھا میری گود سے لیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تو ملتا..... ہم میں سے کسی کو نہیں ملا''

''بھئی کوئی چور ڈاکو نہ ہو..... چوکیدار کو جا کے الرٹ کرتے ہیں'' ذیشان بھائی تو اُٹھ کھڑے ہوئے

''سچی بتا لیلیٰ..... تو ہمیں بنا تو نہیں رہی'' اریان بھائی نے میرا بازو ہلایا۔

''قسم سے..... میں نے اُسے آتے دیکھا، محفل میں جا کے بیٹھتے دیکھا پھر اس کے بعد خیال نہیں کیا۔ اور فنکشن کے بعد چائے کا کپ لے کر گئی.....''

میں نے پھر سے ساری روئیداد دُہرائی۔

''شانی بھائی..... کون ہو سکتا ہے؟''

''اریان یار میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لمبا، خوبرو..... سفید شلوار قمیض

''اکثر نوجوانوں کی جینز تھیں۔''

''بھئی یہ کلف لگے شلوار قمیض کہاں پہنتے ہیں نوجوان، جمعہ نماز کے سوا'' بھابی نے دلیل دی۔

بھائیوں نے چوکیدار سے پوچھا اُس نے ایسے حلیے کے کسی بندے کے بارے لاعلمی کا اظہار کیا۔ برتن اُٹھانے والا لڑکا رہ گیا تھا۔ میں نے سب کے سامنے اُسے بلا کر پوچھا۔ وہ سوچنے کا لمبا وقفہ لے کر بولا۔ ''باجی'' اور تو لان میں کوئی نہ تھا۔'' میری منظر کشی کرنے پر ''فلاں صوفہ..... فلاں کونہ''

وہ سر کھجانے لگا

''باجی میں نے غور نہیں کیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا''

سب اسے میرا واہمہ قرار دینے لگے۔ میں خود کو احمق محسوس کر رہی تھی۔ مزید یقین دلانا خوف پیدا کرنا تھا یا مذاق اُڑوانا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اکثر تنہائی میں میرا ذہن فلم کی طرح وہ منظر دہراتا۔ ہر بار پہلے سے زیادہ یقین ہو جاتا کہ وہ میرا واہم نہیں تھا۔ میں نے صرف دیکھا ہی نہ تھا بات بھی کی تھی آواز بھی سنی تھی۔ جیتے جاگتے انسان کو سامنے پایا تھا۔

گرمی کی چھٹیوں میں (اگرچہ یہ چھٹیاں نہ بھائیوں کو ہوتی تھیں نہ مجھے) سکول والے بچوں کی ضد اور موسم کی شدت نے دونوں بھائیوں اور ہم دونوں بہنوں کو شمالی علاقہ جات کی سیر کا پروگرام بنانے پر آمادہ کیا۔ سکردو کی طرف ہماری بھری ہوئی ہائی ایس (ماشاءاللہ) روانہ ہوئی۔

سکردو قراقرم پہاڑ کا گیٹ وے ہے، سرد ساحرانہ قدرتی مناظر اور سب کا ساتھ سیر کا لطف دوبالا کر رہا تھا۔ اروما کے میاں ساتھ نہیں آ سکے تھے ہم دونوں بہنیں مل کر اُن کا چار سالہ شرارتی بچہ سنبھال رہی تھیں۔

ذیشان بھائی ان علاقہ جات کی کافی معلومات رکھتے تھے اور سب کے علم میں اضافہ کرتے جا رہے تھے کے ٹو، دنیا کی

دوسری بلند چوٹی، اسی پہاڑ پہ تھی۔ بلندیوں کو دیکھ کر اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ہیبت اور جلال دل میں جاگزیں ہوتا۔ ہر کسی کی زبان پہ ''سبحان اللہ'' تھا۔

اپر کچورا جھیل پر لطف اندوز ہوتے سارا دن گزر گیا۔ شام ڈھلنے لگی میں اکیلی چلتے چلتے سبزے ڈھکے پتھروں پر قدم جماتی شفاف پانیوں اور مصفا ہوا کو محسوس کرتی پہاڑ کے قدموں میں ستانے بیٹھ گئی۔ فطرت سے عشق تو فطرت میں تھا۔ میرے سامنے اور پشت پہ بلند و بالا بے مہر پہاڑ تھے۔

بے مہر اس لیے کہ اُن کو آدم زاد کے آنے جانے سے سروکار نہ تھا۔ وہ جہاں تھے جیسے تھے وہی جمے ہوئے تھے۔ اس لیے پہاڑ کی سی استقامت مثال دی جاتی ہے۔

''لیلیٰ''

کسی کے آواز دینے پہ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔

''جی بھائی'' اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتنے قریب تو کوئی بھائی نہیں تھا۔ جتنے قریب سے آواز آئی تھی۔ سالگرہ کا وہ لمحہ میرے سامنے زندہ ہو گیا۔ وہی آواز...... وہی میرا جواب...... میں ڈر کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پتھروں پہ جا گرز والے پاؤں جماتی اُترنے لگی ۔ خوف رگوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ چند قدم چلی تھی کہ دیکھا اُسی پہاڑ پہ میری جگہ سے معمولی فاصلے پر کوئی بیٹھا تھا...... کوئی نہیں وہی بیٹھا تھا۔ دل اُچھل کر حلق میں آ رہا۔ بھاگنا چاہتی تھی مدد کے لیے پکارنا چاہتی تھی۔ کہ وہ سبک خرامی سے مرے سامنے آ گیا۔ وہی سفید لباس وہی تمکنت وجاہت...... مگر آج وہ میرے لیے سراپا خوف تھا۔

''میں غافر ہوں''

''آپ کوئی بھی ہوں......'' میں بمشکل بول پائی

''ایک منٹ رُک جایئے'' اُس کے مہذب لہجے نے خوف کچھ کم کیا

''آپ...... آخر ہیں کون؟''

''سکون سے بات تو سنتے نہیں...... خوف سے بخار ہو جاتا ہے...... ہم تو آپ کے ساتھ جہنم تک میں ہیں۔ کیا پتا جنت میں بھی ہوں''

کیا کہہ رہا تھا وہ...... سمجھ سے بالاتر تھا۔

''اللہ نے کہا ہے ناں...... میں جہنم کو جنوں اور انسان سے بھر دوں گا۔''

''تو؟''

''خلیفہ صاحب...... ابدی ساتھی سے ڈرنا ٹھیک نہیں'' وہ پہلی بار مسکرایا سمجھ مجھے اب آ رہی تھی کہ وہ کون ہے اور یہ سمجھ جانے کے بعد ایک پل بھی رُکنا محال تھا مگر اس کی موجودگی ایسی قوت تھی کہ ہلنے نہ دیتی تھی۔

''آپ مجھے ذہین انسان......''

''ناں...... ناں...... انسان نہیں'' اُس نے بات کاٹ دی۔ میں بے ہوش ہو کے گرنے

والی تھی کہ وہ دو قدم پیچھے ہٹا جیسے مجھے جانے کا راستہ دے رہا ہو۔

''وہاں گھر ہے میرا.....'' پہاڑ کی چوٹیوں کی طرف اشارہ کیا پھر بازو بڑھایا جیسے ساتھ چلنے کی پیشکش ہو۔ کہا

''ذہانت کی تلاش مجھے خلفاء برادری میں لے جاتی ہے۔''

میں نے قدم بڑھایا۔

''لیلیٰ..... ساری کہانیوں میں تم نے یہی پڑھا کہ ..... ہم شر ہیں..... ستاتے ہیں..... لیکن تم تو اس سیارے کے خلیفہ تھے..... تم نے اپنا فرض کتنا نبھایا؟ ہمیں علم رسا کیا؟ ہمارا ہاتھ تھاما؟.....

میں خوف نہیں ہوں لیلیٰ ..... میں شر نہیں ہوں لیلیٰ.....'' وہ میرے برابر چلتا ہوا بول رہا تھا۔

''تم Matter میں ہو..... میں نے تمھاری خاطر Matter اوڑھ رکھا ہے .....تم سے بھی یہ Matter لے لیا جائے گا۔ مرنے کے بعد ہم یکساں لیول کی مخلوق ہوں گے۔ بنتِ خلیفہ!'' اس نے ایک بار پھر بازو بڑھایا

''نہیں.....'' میں زور سے چیخی..... اُس کا مُنہ لٹک گیا۔

''لیلیٰ لیلیٰ..... آ جاؤ اندھیرا ہو جائے گا'' اروما کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔

وہ یکدم مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ اتنا دور کہ پہاڑی میں میں ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا

نہ تم ہمیں جانو

نہ ہم تمھیں جانیں.....

اروما نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ''تم کس کو دیکھ رہی ہو، تم جواب کیوں نہیں دیتی تھی..... کون تھا یہاں؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا

اور ہاں..... ریسٹ ہاؤس پہنچ کر مجھے بخار ہو گیا تھا۔

اروما بہت فکر مند تھی بلکہ پریشان تھی۔ اُس نے مجھ سے بار بار پوچھا کہ کیا ہوا ہے، تو میں نے کہا

''اروما..... یہ سوال نہ کرو۔ میرے جواب میں تم نے کہنا ہے مجھے OCD ہے مجھے وہم کی بیماری ہے۔ میں ذہنی مریضہ ہوں میری شادی کر دینی چاہیے.....''

میں ہذیانی انداز میں کہے گئی۔

''کیا وہ..... وہ ..... وہی..... ظافر تھا؟''

خوف اُس کو جملہ پورا کرنے نہ دیتا تھا۔

''وہ بہت ذہین.....'' میں نے اروما کے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھے۔

''انسان ہے؟'' وہ تھوک نگل کر بولی

''نہیں..... انسان نہیں ہے'' میں غافر کی طرح مسکرائی

اب بخار چڑھنے کی باری اروما کی تھی۔

☆☆☆☆☆

پہلو میں چلتی موت

رات ساڑھے بارہ بجے پیٹر طبلے پر کسی فلمی گیت کی دُھن پر یسوع کی محبت میں ٹوٹی پھوٹی اور بے جوڑ شاعری ترتیب دے رہا تھا۔ کہ کمپنی کے سپروائزر میاں فاروق علی نے فون کر دیا ہارمونیم پہ بیٹھا پرویز اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے گلہ مندی سے پیٹر کو گھورنے لگا، لیکن پیٹر نے اُسے مطمئن کرتے ہوئے فون نظرانداز کر دیا، طبلے ہارمونیم اور پھٹے ہوئے گلے کی لمبی لمبی تانوں میں موبائل فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ پیٹر نے معاملے کی سنجیدگی محسوس کرتے ہوئے طبلہ بجانا بند کیا۔ اشارے سے ہارمونیم بند کروایا اور گہری نیند سے جاگے ہوئے آدمی کی اداکاری کرتے ہوئے بولا سر جی السلام علیکم ---- دوسری طرف سے میاں فاروق علی کی آواز اُبھری کیوں بھئی اتنی جلدی سو گئے تھے؟ دُنیا ہنگاموں سے بھری ہوئی۔ لوگ جاگ رہے ہیں۔ صبح ہماری عید۔ لیکن تمہاری ڈیوٹی ہے مجھے ابھی ابھی چوکیدار رحمت کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تمام کمروں میں بجلی نہیں ہے منیجر صاحب کا دفتر بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ شوروم، اور فیکٹری کے علاقے میں بجلی نہیں ہے۔ لہٰذا تم صبح 5 بجے جا کر فیکٹری اور ایڈمنسٹریشن بلاک اور شوروم کے تمام کمروں کی بجلی بحال کرو۔ دیکھو عید کے دنوں میں کوئی فیکٹری کا صفایا ہی نہ کر دے۔ ویسے --- جانا تو تمہیں ---- ابھی چاہیے تھا لیکن فاصلہ زیادہ ہے لہٰذا میں نے سوچا کہ آج چوکیداروں کو ذرا ہٹ کر بھی ڈیوٹی دینا چاہیے۔ لہٰذا تم نے کل صبح بجلی دُرست کرنی ہے۔ اور جلدی چلے جانا۔ تاکہ سیکیورٹی کا سارا عملہ عید کی نماز بھی ادا کر سکے --- میں کل کسی وقت تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔

پیٹر نے بلبلا کر طبلے پر دو انگلیاں دے ماریں۔ سنسناتی ہوئی لمبی کراہ گونجی --- لو بھئی اپنی تو کل کی چھٹی برباد ہوگئی۔ فیکٹری کی بجلی خراب ہوگئی ہے۔ صبح صبح جانا پڑے گا۔ پرویز نے ہارمونیم ایک

کلیم خارجی

طرف کھسکا کر جیب سے چرس نکالی۔ اور میسحی گیت کی دُھن پر پگھلی ہوئی چرس اور سگریٹ کے تمباکو کو ہتھیلیوں پر مسلتے ہوئے بولا گیت تیار تھا۔ پھر آنکھ دباتے ہوئے بولا لٹنی گل کی آواز اچھی ہے۔ اُس سے گوائیں گے۔ زبردست گاتی ہے۔۔۔

پیٹر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اوئے۔ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ اس پر گندی نظر نہ رکھ۔۔۔

اوئے چل۔ پرویز نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ اور وہ جو فادر اُسے روزانہ بچہ دیتا رہتا ہے۔ خیر ہے کبھی ہم سے بھی پاک شراکت لے نا۔۔۔ ہے ویسے پوری کی پوری انج۔ من ہے۔ بس تھوڑی سے کالی ہے۔۔۔۔ (ایسے نہیں کہتے)۔ گناہ ہوتا ہے۔ یہ منہ کی بدی میں آتا ہے۔

جانے دے یار۔ پرویز نے دھواں نتھنوں سے نکالتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ انگریز بڈھا۔ سب کچھ کرلے۔ کوئی پرواہ نہیں۔ اور ہماری بات بھی بدی۔ اسی لیے تو گرجے نہیں جانا پارمونیم کا شوق ہے۔ ورنہ میں فادر کا منہ بھی نہ دیکھوں۔۔۔ تیری اماں نے بہت سی باتیں۔ میری بڈھی کو بتائیں ہیں۔ چل رہنے دے۔ جو بات دبی ہوئی ہے دبی رہنے دے۔ سگریٹ پھونک کر پرویز نے کپڑے یوں جھاڑے۔ جیسے راکھ سے بھر گئے ہوں۔ کل دوبارہ پریکٹس کرلیں گے۔ تم لٹنی گل کو بلا لینا۔۔۔ چند ایک فلمی گانے بھی سن لیں گے۔۔۔

صبح ۵ بجے پیٹر نے اپنے اوزاروں کا تھیلا ڈھونڈا۔ اُسکی آنکھیں پوری طرح کھل نہیں رہی تھیں۔ ادھ نکلی آنکھوں سے اس نے ہر چیز ٹٹول کر دیکھی۔ وہی رات کی پہنی ہوئی پتلون سیدھی کی۔ پھٹی ہوئی بنیان کے اوپر سرخ رنگ کی قمیض پہنی۔ وہی بدبُو والی جرابیں جو اس نے رات سفید بوٹوں کے اندر ٹھونس رکھی تھیں۔ جھاڑ کے پہن لی۔ بوٹوں کے تسمے باندھتے ہوئے اُس نے رُوت کو آواز بھی دی رُوت نے بیماروں کی طرح کراہتے ہوئے کہا۔ اوں۔۔ ہائے۔ کی آواز لگائی۔ اور پھر چُپ ہوگئی وہ منت کرتے ہوئے بولا۔ ایمرجنسی جانا پڑ گیا ہے۔ تھوڑا سا ناشتہ بنادے۔

لیکن روت گہری نیند میں پڑی رہی۔ اُس نے تیسری مرتبہ اُسے جگاتے ہوئے کہا۔ آج عید ہے بازار اور ہوٹل بھی بند ہوں گے۔ ایک کپ چائے کے ساتھ روٹی بنادے۔

روت نیند میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ میں تو سبھی چھٹی ہے۔ آج۔ میں نے آٹا بھی نہیں گوندھ کے رکھا۔ دودھ والا بھی نہیں آیا تھا۔ بس اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ کچھ دیر بے چاروں کی طرح روت کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے خاموشی سے اپنا موٹر سائیکل گلی میں نکالا۔ اور خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ دو ایک گھنٹے کا کام ہوگا۔ اس نے کک لگائی۔ اور کھلی ویران سڑک پہ مئی کے مہینے کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں لہراتا ہوا۔ فیکٹری پہنچ گیا۔ گیٹ پہ رحمت جٹ نے دروازہ کھولتے

ہی گلہ کرتے ہوئے کہا - ساری رات اندھیرے - اور مچھروں نے ستائے رکھا- رات کو آجاتے نا- رحمت جٹ نے اپنے اونچی آواز اور چہرے کے تلخ تاثرات میں جان بوجھ کر پیٹر کے منہ سے عید مبارک کا کلمہ نظر انداز کیا- اس نے گیٹ دوبارہ بند کرتے ہوئے اپنے خاموش اور جارحانہ رویے سے پیٹر کو یہ جتا دیا تھا کہ اسکی طرف سے عید مبارک کا جملہ اُسے پسند نہیں آیا- فیکٹری ایریا کے اندر کے گیٹ کے پاس برآمدے میں شیخ صادق اونگھ رہا تھا- پیٹر کی آواز سن کر وہ تھکا تھکا سے اُٹھ کر آیا- پیٹر نے احتیاط، اُسے عید مبارک کہنے سے گریز کیا- اُسے احساس ہونے لگا کہ غیر مسلم کے منہ سے، عید مبارک کا سن کر خوشی کی بجائے انکے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے - کیونکہ گزشتہ کئی برسوں سے وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے آس پاس کے تمام لوگوں نے اُسے کرسمس، یا بڑے دن کی مبارک باد دینا ترک کر دیا تھا- اُس نے سن رکھا تھا کہ کچھ مذہبی حلقوں اور مولویوں نے اُسے گناہ قرار دے رکھا تھا - اپنے پادریوں کے رویے دیکھ کر اُس پر مسلمانوں کا یہ انداز تکلیف کی بجائے گہری چُپ کا سایہ ڈال دیتا تھا- چاچا رات آندھی چلی تھی- اس نے اپنا تھیلا کندھے سے لٹکاتے ہوئے کہا ہاں- کوئی ایک گھنٹہ تک آندھی چلی--؟ پھر گھپ اندھیرے، حبس اور مچھروں نے بیڑا غرق کر دیا-- میں تو اذان کے بعد نماز پڑھ کے سویا ہوں---

سب سے پہلے وہ سیدھا فیکٹری کے ٹرانسفارمر کی طرف گیا- اکیلے سیڑھی گھسیٹتے ہوئے - وہ ٹرانسفارمر تک پہنچا- تو کچھ دیر سیڑھی پہ پاؤں رکھے- خود کو سنبھالتا رہا- ایک اور آدمی کی ضرورت تھی- لیکن ان چوکیداروں میں کوئی بھی اُسے اپنی طرف سے کسی خاص مدد اور خلوص کا حقدار نہیں سمجھتا تھا- ہمت کر کے وہ سیڑھی پہ چڑھ کر ٹرانسفارمر تک پہنچا- آندھی کے جھٹکوں سے دو لنک ہڑپ کر چکے تھے - وہ دوبارہ نیچے آیا- سٹور روم سے نئے لنک کے لیے موٹی تاریں ڈھونڈ کر لایا - انہیں لنک پر چڑھایا- اور ٹرانسفارمر کی مین لائن سے جوڑ دیا- فیکٹری ایریا کی بجلی آن ہوگئی- شوروم کے بھی چند بلب روشن ہوگئے تھے- لیکن تین چار لائٹس آف تھیں - وہ شوروم کھلوانے کے لیے شیخ صادق کی طرف آیا- لیکن وہ اپنی جگہ پہ نہیں تھا- چنانچہ وہ مین گیٹ کی طرف چلتا ہوا آیا- مین گیٹ کے کمرے میں تینوں چوکیدار عید کے ناشتے میں مصروف تھے- جاوید عرف جیدا اب اُسے نظر آیا تھا - وہ اُسے دیکھتے ہوئے بولا- تم آچکے ہو - ان دونوں نے مجھے بتایا نہیں تھا ورنہ میں تمہارے لیے بھی ناشتہ لے آتا- ابھی اپنے گھر سے عید کا ناشتہ لایا ہوں- پیٹر نے محسوس کیا پراٹھوں، انڈے، حلوہ چائے کا تھرماس نے اسکی انتڑیوں

میں تڑپ ہی پیدا کردی تھی لیکن وہ بے نیازی سے بولا، شوروم کی چابی چاہیے تھی۔ لائٹیں چیک کرنی ہیں۔

ٹھیک ہے تم جاؤ۔۔۔ رحمت بولا ، صادق چابیاں لے کر آتا ہے، پیٹر نے اس دھتکار کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا، تمہارے پیچھے چل پڑے ہیں۔ بجلی آ گئی۔۔ کچھ اور سنے بغیر وہ شوروم کی طرف چل پڑا۔ اور ٹھنڈی سیمنٹ کی سیڑھیوں پہ بیٹھے بیٹھے لیٹ گیا ۔ وہ معمولی ذھنیت کا نوجوان تھا۔ گزشتہ پانچ برس سے وہ موٹرسائیکل بنانے والی اس کارخانے میں الیکٹریشن کے طور پر بھرتی ہوا تھا ۔ انسانی رویوں ، تعصبات اور اندرونی نفرتوں کو ناپنے کی صلاحیت بہت معمولی تھیں، وہ ایک بازو پہ سرٹکائے ۔ اور دوسرے ہاتھ کو پیٹ پر رکھے ۔ خود سے بولا، کام جلدی ختم ہو جائے گا۔ آٹھ بجے ہیں۔ خیر گھر پہنچ کر جان آ جائے گی ۔ یہ لو چابیاں ۔۔ شیخ صادق نے اُسے جیسے جگاتے ہوئے کہا۔ ہم تینوں عید کی نماز کے لیے جارہے ہیں ۔ تم مین گیٹ اندر سے بند کرلو ۔ آدھ گھنٹے تک ہم واپس آجائیں گے ۔ چوکیدار صادق نے چابیاں اس کے پیٹ پہ پھینکتے ہوئے کہا۔ اور پھر تیز تیز قدموں سے مین گیٹ کی طرف چلا آیا۔ پیٹر نے چابیاں اپنے پیٹ سے اُٹھائیں ۔ اور شوروم کا دروازہ کھولا، نئے تیارشدہ موٹرسائیکلوں پہ رات کی آندھی کی وجہ سے گرد کی تہیں جم چکی تھیں، لہریں بنی ہوئی تھیں ۔ سوئچ بورڈ کی طرف جاکر اس نے اُسے کھولا، کرنٹ اور کنکشن چیک کیے کہ بجلی کی بار بار آنے جانے کی وجہ سے تین لائٹیں فیوز ہوچکیں تھیں۔ اُنھیں اُتار کے نئی لائٹیں نصب کرنا ضروری تھا۔ اُسے پھر اپنی جسمانی کمزوری ، بھوک اور ایک دوسرے آدمی کی ضرورت محسوس کی۔ چھت سے لگی لائٹیں اُتارنے کے لیے چار پائیوں والی اونچی سیڑھی چاہیے تھی۔ جسکے سرے پر ایک مضبوط لکڑی کا پھٹہ ، نصب تھا ۔ اس چوکور سیڑھی کو کھینچ کر شوروم تک لانا وقت طلب کام تھا۔ ایک تو اس کا وزن بہت زیادہ تھا۔ دوسرا اُسکی اونچائی بھی ایسی کہ اُٹھانا ناممکن تھا۔ قدم قدم سیڑھی گھسیٹ کر وہ شوروم تک پہنچا ۔ شوروم کے اونچے برآمدے سے سیڑھی اندر لے جانا سخت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ عام دنوں میں چیڑاسی یا خاکروب اسکی مدد کو آن پہنچتے تھے۔ لیکن آج وہ اکیلا تھا۔ جسمانی کمزوری ، بے آرامی غذا کی کمی، اور ایک نوالے کی طلب اور شدید مشقت نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے ۔ اپنے آپ کو ہمت اور اُمید دلاتے ہوئے اس نے آدھے گھنٹے کا کام پورے ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کیا۔ ایک لائٹ اتار کے نیچے آنا۔ پھر نئی لائٹ لیکر دوبارہ چڑھنا۔ گردن کو پشت کی جانب لٹکا کر لائٹ لگانا۔ پھر نیچے

آنا۔ سیڑھی گھسیٹ کے دوسری لائٹ تک جانا۔ اس سارے کام میں اُسکے اعصاب شل ہونے لگے۔ جسم پر طاری لرزے نے بھی اس کے حواس ادھیڑ دیئے تھے 15۔ منٹ تک وہ کسی 70 سالہ بوڑھے کی طرح اپنے سانس، جسم کی توانائی اور کپکپی پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ جب وہ آخری لائٹ نصب کر رہا تھا۔ تو اسکے کانوں میں مین گیٹ کی آواز سنائی۔ اسکے منہ سے پریشانی کے عالم میں چیخ نکل گئی۔ نیچے اُتر کے گیٹ تک جانا۔ ایک اور مصیبت تھی۔ کسی بہادر اور کمزور بوڑھے کی طرح وہ نیچے اُترا۔ اپنی طرف سے وہ تیز چل رہا تھا۔ لیکن اسکے پاؤں زمین سے زیادہ اُٹھنے کی بجائے ایک رگڑ لگا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کنڈی قدرے آسانی سے نکل گئی تھی ۔ رحمت نے اندر قدم رکھتے ہی حقارت سے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ہم آدھے گھنٹے سے دروازہ بجا رہے تھے۔ کھڑے کھڑے ہماری ٹانگیں دکھنے لگیں۔ تم تک آواز نہیں پہنچی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ یہ نہ کہہ پایا۔ کہ تم لوگ تو آدھے گھنٹے کے لیے گئے تھے۔ اور پورے دو گھنٹے بعد واپس آئے ہو، لیکن وہ تحمل سے بولا، شوروم یہاں سے دُور ہے، اور میں اوپر لائٹ لگانے میں مصروف تھا۔ چوکیدار کی حقارت آمیز گھوریاں برداشت کرتا ہوا وہ اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کی طرف بھاری قدموں سے روانہ ہوا۔ اس نے چھوٹے بڑے تمام اسٹورز اور دفتروں کے کنکشن درست کر دیئے مسئلہ ٹرانسفارمر کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اُسے ایک گودام سے دوسرے گودام تک ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک جانا، مشکل لگ رہا تھا لیکن وہ کام کرتا چلا گیا اپنے کمزوری اور نقاہت محسوس کرتے ہوئے اب اسکی لمبی سانسیں بھی چلنے لگیں تھی۔ جب وہ منیجر کے دفتر کے قریب جانے لگا تو شیخ صادق اُسے پکارتا ہوا قریب آیا۔ اور خوشی سے چہکتے ہوئے بولا منیجر صاحب کا کمرہ کھلا رہتا ہے تم مجھے شوروم کی چابیاں دیدو۔ ہم کھانا کھانے لگے ہیں منیجر صاحب کا ملازم ہم تینوں کے لیے عید کا کھانا لایا ہے۔ تم چابیاں دیدو۔ اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی تمہارا کام تقریبا ختم ہو چکا ہے۔ منیجر صاحب کے کمرے میں کچھ زیادہ کام بھی نہیں ہوگا۔ اُس نے جیب سے چابیاں نکال کر ذرا فاصلے سے شیخ صادق کی ہتھیلی پہ رکھ دیں۔ اور منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

منیجر کے کمرے میں جاتے ہی اُسے خاص قسم کی خوشبو اور ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اگرچہ منیجر صاحب کے ساتھ اُسکا بہت کم واسطہ پڑتا تھا لیکن اس کے دل میں بہت عزت اور عقیدت تھی اُسے اپنا پہلا دن یاد تھا۔ جب منیجر صاحب نے فیکٹری کے

اکاونٹنٹ عبدالرزاق کی مخالفت کے باوجود اُسے الیکٹریشن کی ملازمت دی۔ عبدالرزاق اتنا بے خوف اور خودغرض تھا کہ پیٹر کے سامنے وہ منیجر سے کہہ رہا تھا۔ سر جی غیر مسلم ہم سارے مسلمان ہیں۔ بہت سے معاملات میں اُلجھن پڑے گی۔ میرا بھتیجا عالمگیر ایف ایس سی پاس ہے، نماز روزے کا پابند ہے۔ قرآن کا حافظ ہے سر جی۔ کام سیکھ جائے گا تھوڑا بہت تو اُسے پہلے بھی کام آتا۔ ہمارے گھر اور محلے میں بجلی کے سارے کام وہی کرتا ہے جی۔ میں گزشتہ دس سال سے آپکا نمک خوار ہوں۔

منیجر نے پہلے تو رحم سے پیٹر کی طرف دیکھا تھا۔ پھر عبدالرزاق کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ تم اس کے سامنے اِسکا حق مار رہے ہو۔ میں نے دو مہینے آزمائشی طور پر پیٹر کو آدھی تنخواہ پر ملازم رکھا تھا۔ لیکن وہ کام نیک نیتی اور مہارت سے کرتا رہا ہے۔ یہاں کس کو رکھنا۔ اور کس لیے رکھنا ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ اپنے بھتیجے کو آگے پڑھاؤ۔ ہوسکتا ہے وہ انجینئر بن جائے۔ ایف ایس سی والے نوجوان چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ نہ چھوٹے خواب دیکھتے ہیں میں نے اِسے الیکٹریشن کے طور پر بھرتی کرلیا ہے۔ اب کوئی فرشتہ بھی آجائے تو اسکی خاطر میں اُسے محروم نہیں کروں گا۔ مجھے الیکٹریشن چاہیے دُعاؤں اور معجزوں والی سرکار نہیں چاہیے۔ اور الیکٹریشن کے کام کے لیے جو بھی بھرتی ہوتا ہے یا آئندہ ہوگا۔ وہ صرف الیکٹریشن ہوگا۔ اُسے صرف اپنے کام کو ذمہ داری اور دیانت داری سے کرنا ہوتا ہے۔ عبدالرزاق صاحب پروفیشنل آدمی بن کے فیکٹری میں ۔۔۔ نوکری کرو، منیجر کی باتیں ابھی تک اس کے ذہن میں اپنے رعب کے ساتھ تازہ تھیں اس نے اپنے دل میں منیجر کے لیے بہت زیادہ احسان مندی سی محسوس کی۔ یہ کام کرنے سے پہلے اس نے منیجر صاحب کے میز پر جمی گرد دیکھی۔ تو اپنے تھیلے سے کپڑا نکال کر اُس نے میز پر بچھے ہوئے موٹے شیشے کو اچھی طرح صاف کیا۔ میز پر پڑی ہوئی چھوٹی بڑی تمام چیزوں کو صاف کر کے ترتیب سے رکھا۔ اُسے اس کمرے میں سکون اور خوشی محسوس ہونے لگی تھی۔ کمرے میں بچھے قالین پر بھی اُسے کہیں مٹی کے دھبے نظر آئے تو انہیں صاف کیا۔ اپنے سفید بوٹ تو پہلے ہی باہر اُتار کے اندر آیا تھا۔ جب وہ قالین پر جھک کر کمزوری اور تھکن کے باوجود قالین صاف کر رہا تھا۔ تو منیجر کی بڑی میز کے نیچے ایک پرانا سا داغدار تکیہ اور ایک موٹی سی چادر نظر آئی اُس نے باہر نکال کر جھاڑ کر دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ان دونوں چیزوں کا مالک چوکیدار شیخ صادق تھا جو یقیناً رات کو منیجر صاحب کے کمرے میں AC کی سہولت کا لطف اُٹھاتے ہوئے۔ قالین پر مزے کی نیند سویا

کرتا تھا۔ پیٹر نے لائٹیں اور ایر کنڈیشنڈ آن کر کمرے کا جائزہ لیا۔ واش روم کی لائٹیں خراب تھیں۔ ایر کنڈیشنڈ بھی آن نہیں ہو رہا تھا۔ واش روم کی لائٹیں ٹھیک کر کے اس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر کہا۔ اوئے میں نے تو صبح سے منہ ہی نہیں دھویا۔ چہرے پہ پانی ڈالتے ہی اُسے تازگی اور اطمینان کا احساس ہوا۔ اس نے اوک بھر کے دو تین مرتبہ اچھی طرح پانی پیا۔ جسم میں توانائی سی دوڑنے لگی۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر اس نے اپنی پشت سے ہاتھ خشک کیے۔ دیوار پہ اونچی جگہ پر نصب ایر کنڈیشنڈ کے لیے پھر اُسے ایک اونچے اسٹول کی ضرورت تھی۔ چوکور سیڑھی تو لانا مشکل تھی۔ وہ پھر گودام کی طرف گیا۔ اُسے کوئی مناسب چیز نظر نہ آئی۔ منیجر صاحب کے کمرے میں مہمانوں کے لیے چھ کرسیاں تھیں۔ لیکن وہ اتنی نفیس اور نازک تھیں۔ کہ اُن پہ پاؤں رکھ کے کھڑا ہونا اُسے مناسب نہیں لگا۔ کرسیوں پہ نیلے گہرے رنگ کے چرمی کشن دیکھ کر اُس نے خود سے کہا تھا نہیں بھئی کشن خراب ہو جائے گا۔۔۔۔ سٹور میں جا کر اُس نے پرانے تختے اُٹھائے پھر ایک تختے کو چوکیدار شیخ صادق کی کرسی کے بازوؤں پہ رکھ کے اُس نے اپنے دونوں بازوؤں کے زور سے تختہ کی مضبوطی دیکھنا چاہی تو تختہ ایک چٹاخ کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اس کی ناک ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کرسی کے پشت والی لکڑی سے ٹکرا گئی۔ آنکھوں کے سامنے اُسے سفید سفید دھبے تیرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ درد اور آنکھوں میں پھیلتی دھوپ سے گھبرا کر وہ فرش پہ بیٹھ گیا۔ اور پھر لیٹ کر سستانے لگا۔ ناک پہ ہاتھ رکھتے ہی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ناک کا بانسہ اور اوپر والا ہونٹ سوجھ گئے۔ چہرے پہ سُوجھن کی وجہ سے اُسکی آنکھوں سے پانی سا برسنے لگا تھا۔ فرش سے سر اُٹھاتے ہوئے اُسکا درد بڑھنے لگا۔ لیٹے لیٹے وہ اپنے آپ سے سوالات کرنے لگا۔ کون آئے گا تیری تکلیف کم کرنے کوئی نہیں۔ کب تک لیٹ کر۔ کس کا انتظار کرتا ہے۔

میرے سوا میرا کام کون مکمل کرنے والا ہے۔ چوٹ کی وجہ سے موت تو نہیں آ رہی؟؟ ہاتھ پاؤں۔۔۔ تو ٹھیک ہیں نا۔۔۔ میں کس کی آس۔۔۔ میں یہاں لیٹ کر درد سہتا رہوں۔۔۔؟

مجھے اُٹھنا ہوگا۔۔۔ میں اُٹھ سکتا ہوں۔۔۔ بس ایر کنڈیشنڈ آن کرنا رہ گیا ہے؟ یہ ضروری ہے۔۔۔۔ سب سے ضروری تو یہی کام ہے۔۔۔ میں یہ کام کر لوں گا۔ سوالات کے بجائے مکالمے شروع ہو گئے ۔ اس نے اپنے دونوں بازو ٹھنڈے فرش پہ پھیلا کر فرش کی ٹھنڈک کا لطف لیا۔ پھر اُس کے ذہن میں گھر اور رشتہ داروں کے نقشے گھومنے لگے۔ اُسکی ماں خفا ہو کر۔۔۔ لڑ جھگڑ

کے - گالیاں دے کر - دوسرے بھائی جیکب کے ہاں منتقل ہو چکی تھی۔ لیکن آئندہ ہفتے اُس نے واپس آجانا تھا۔ وہ کئی سالوں سے یہی کرتی چلی آرہی تھی۔ روت کا چہرہ اس کے سامنے لہرانے لگتا۔ روت اپنے تئیں۔ ایک عبادت گزار ۔اور سچی مسیحی عورت تھی۔

وہ اکثر آس پاس کے گھروں میں جا کر زبور اور دُعائیں سکھانے کے کام پر مامور کر چکی تھی۔ موت کے بارے میں سوچتے۔ پیٹر کے منہ سے پنجابی کا زبور گنگناہٹ کے ساتھ برآمدے میں گونجنے لگا۔ رب سچ مچ اوس دی سندا اے---- تین چار مرتبہ تکلیف کے ساتھ کراہتے ہوئے یہ گیت گاتے ہوئے اس کے الفاظ خود بخود بدل گئے۔ رب سچ مچ کس دی سن والے----

ہمت کر کے -- جھومتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھا -- کس کی آس --- کس کے سہارے۔ یہ اُس کام ختم نہیں ہوسکتے اس جواب کی نفی۔ اُسکے ارادے کو پھر سے مضبوط کیا۔ وہ پھر گودام میں داخل ہوا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے اور ناک کے درد کے احساس کے باوجود اُسے موٹر سائیکل کی بڑی سی سیٹ مل گئی۔ جس کے نیچے اسٹیل کا مضبوط فریم تھا۔ اُس نے سیٹ اٹھائی۔ کرسی پہ رکھ کے پھر اسی طرح اندازہ لگایا۔ پہلے کرسی اُٹھائی۔ پھر اس پہ سیٹ ٹکا کر۔ ایئر کنڈیشنڈ کا جائزہ لیا۔ پھر باہر آکر اپنا تھیلا اٹھایا۔ کام میں آسانی دیکھ کر اُسکی تکلیف اور کمزوری میں کمی آگئی تھی۔ کرسی پر چڑھ کر سیٹ پر پاؤں رکھ کر اُس نے خود کو محفوظ سمجھ کر خوشی محسوس کی ایئر کنڈیشنڈ کا فریم کھولتے کھولتے اُسکی آنکھیں بھی دوبارہ کھل سی گئیں تھیں - تاروں کے جوڑ ٹھیک تھے۔ آن - آف اور ہائی - لو کے بٹن چیک کیے۔ سوئچ بورڈ میں ایئر کنڈیشنڈ کے مطابق سٹڈز دیکھے۔ ایئر کنڈیشنڈ کی منسلک تار کا سوئچ کھول کر دیکھا۔ سارے سکریو دوبارہ سے سختی کے ساتھ پیوست کیے۔ پورا سوئچ بورڈ کھولا۔ سارے کنکشن کے جوڑ دوبارہ مضبوطی سے باندھ کر ان پر نئی سرخ ٹیپ لگائی۔ ایئر کنڈیشنڈ آن کیا۔ تھوڑی دیر ٹھنڈک کے پھیلنے کا انتظار کیا۔ ہائی اور لو کے ریموٹ کنٹرول سے چیک کیا۔ ایئر کنڈیشنڈ کی کارکردگی دیکھ کر اُس نے پھر کچھ گنگنانا شروع کیا۔ وہ نیچے کارپٹ پر ٹانگیں پسار کر کے بیٹھ گیا۔ کمرہ ٹھنڈا ہو جانے کے باوجود تمام لائٹوں کے آن ہونے کی وجہ سے جگمگا رہا تھا۔ اس نے گنگناتے ہوئے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ میز کے بالکل سامنے کی دیوار پر بڑے سے چاندی کے فریم میں سنہرے تاروں کے ساتھ آیت الکرسی لکھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔ آیت الکرسی کے علاوہ کوئی اور لفظ اُسکی سمجھ میں نہیں آیا۔ دیکھتے دیکھتے اُسکی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ناک اور

ہونٹوں سے درود کی ٹھنڈک اٹھنے لگیں آیت الکرسی پہ نظریں جمائے وہ اٹھ کھڑا- سردی کا احساس اتنی زیادہ ہوا کہ اسکا جسم کانپنے لگا- اُس کا ذہن ایک ہی بات پہ جم کر اس کے اندر گہرے سرد خوف کا اضافہ کیے جا رہا تھا- اگر یہ فریم اچانک اس وقت نیچے گر گیا- تو میری زندگی کا کیا حال ہوگا- میرے پورے خاندان پر نہ ٹلنے والی مصیبت نازل ہو جائے گی- یہ لوگ یہ تینوں بلکہ پورا شہر شاید زندہ ہی جلا دے- کانپتے ہوئے اُس نے ایئر کنڈیشنڈ آف کیا- کمرے کی کھڑکیاں اچھی بند کیں- رات تیز اندھی چلی تھی -اور اگر میرے جاتے ہی آندھی چل پڑی - کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی - تو-- قیامت آ جائے گی- اس نے باہر نکل کر مینیجر کے دفتر کا دروازہ بند کیا- لیکن دروازہ کی ایک ہاتھ میں پکڑے دیر کھڑے رہا- پھر اُس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر چوروں کی طرح جھانک کر آیت الکرسی کے فریم کی طرف دیکھا- فریم اپنی جگہ دیوار پہ قائم تھا- اُس نے آنکھ سے سانس لے کر دل کی دھڑکن سنی- اور دروازہ احتیاط سے بند کر دیا- چند لمحے خاموشی سے کھڑا رہنے کے بعد اس نے دوبارہ جھانک کر فریم دیکھا -اور دروازہ بند کر دیا- کئی بار وہ دروازہ کھول کر جھانکتا اور دروازہ بند کرتا رہا- دوپہر ڈھل چکی تھی- اس نے آخری بار پھر دروازہ کھول کر فریم دیکھا اور دوسری دیوار پہ لگے شاندار گھڑیال میں وقت دیکھا- پونے چار بج رہے تھے- وقت کے احساس نے ایک بار پھر اُسکی مشقت معدے کی بھوک پیاس، جسمانی نقاہت اور عدم تحفظ کے خوف میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا- اس نے خود سے بات کرتے ہوئے کہا مجھے شیخ صادق کو سمجھانا پڑے گا- کہ دفتر کا دروازہ اور کھڑکیاں بند رکھے- ایسا نہ ہو کہ تیز آندھی کے کسی جھونکے سے فریم نیچے آن گرے- اور پھر اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو گویا مزید ڈراتے ہوئے کہا- یہ بات کر کے تو ان گویا ان کے دماغ میں اپنے لیے- ایک نئی مصیبت پیدا کرنے کا منصوبہ ڈالنا ہے- نہیں- نہیں- اس نے چاہا کہ وہ چوکیدار کو ساتھ لے کر آئے- اور تمام کمروں کی بجلی کی بحالی کے ساتھ مینیجر کے کمرے کی ہر شے- خاص کر فریم کی سالم ہونے کا یقین دلا کر گواہ بنا لے- سٹورز وغیرہ بند کر کے وہ مین گیٹ کی طرف گیا- پنکھے کی ٹھنڈی ہوا میں رحمت جٹ تو خراٹے لے رہا تھا- لیکن شیخ صادق کا کہیں پتہ نہیں تھا- اس نے فیکٹری اور شوروم کے احاطے میں جا کر آوازیں دیں- لیکن شیخ صادق وہاں موجود نہیں تھا اُس نے بڑے ڈر اور احترام کے ساتھ رحمت جٹ کو اُٹھایا- رحمت جٹ غصے سے غراتا ہوا اُٹھا- چاچا شیخ صادق چاچا- نہیں ملا- سارے کمروں کی بجلی ٹھیک ہو گئی ہے-اس نے مری ہوئی آواز میں کہا- آپ

چل کر میرے ساتھ دیکھ لیں۔ منیجر صاحب کے کمرے کا ائیر کنڈیشنڈ بھی ٹھیک ہوگیا۔ میرے ساتھ آ۔ میں آن کر کے دکھا دوں۔
میں نے کیا کرنا ہے دیکھ کر۔ مجھے کوئی انعام تو دیتا نہیں مجھے۔ رحمت جٹ للکارتے ہوئے بولا۔ تو نے اپنی ڈیوٹی پوری کرلی ہے۔ تو جا چھٹی کر۔ شیخ گھر گیا ہوا ہے۔ شام کو آئے گا۔ خود ہی دیکھ لے گا۔ چل تو نکل۔ تا کہ مین گیٹ اندر سے بند کرلوں۔
وہ بے چارگی سے رحمت جٹ کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ تکلیف اور مایوسی سے اس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنی رضامندی کا اعلان کیا۔ موٹر سائیکل لیے اُسے یوں لگا۔ جیسے وہ اُسے سنبھال نہیں سکے گا۔ آنکھوں سے بہتے پانی۔ بدن میں اُتری کمزوری اور ناک کی چوٹ کے باعث اُس نے اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے۔ موٹر سائیکل کو کک لگائی دو تین مرتبہ کوشش کے بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوا تو اسکے اندر اندیشے بھی زیادہ ہوگئے۔ احتیاط سے موٹر سائیکل چلتا ہوا وہ مین گیٹ سے باہر نکلا۔ عید کا پہلا دن تھا سڑکیں ویران تھیں۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بہت کم گاڑیاں اور موٹر سائیکل دکھ کر اُسے تسلی ہوئی۔ اپنے ہوش اور اُمید کو قائم رکھنے کی کوشش میں وہ سست روی کے ساتھ موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ آنکھ سے پانی بہنے کی وجہ سے اُسے دیکھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل روک کر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پہ بیٹھ کر آرام کر کے اپنی توانائی اکٹھی کرنے کا ارادہ کیا۔ اُسے اپنے جسم کی حرارت اور تکلیف کو دیکھ کر اُسے اندازہ ہوا کہ اُسے بخار ہے۔ ابھی گھر تک پہنچنے میں آدھے سے زیادہ فاصلہ تھا۔ عصر کی اذان اور لاؤڈ سپیکر پر گونجی تو اس نے اپنے سامنے کے چھوٹے سے بازار کے بیچ میں اُسے ٹھنڈے کنویں والی مسجد کے بلند مینار نظر آئی اس مسجد کے مولانا نے 24 دسمبر کی رات فتویٰ جاری کیا تھا کہ مسیحی برادری سے کھانے پینے کی کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔ اور نہ ہی اُسے کرسمس مبارک کہا جائے۔ اپنے جوش اور علمی وعظ میں اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ مسیحیوں سے تعلق رکھنا بھی گناہ ہے۔ جسکی سزا دُنیا اور آخرت میں لازم ہے۔ مسجد کی اذان کی آواز اور خطیب کے فتویٰ کے احساس نے اُسے ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی توانائی دی۔ کم از کم مسجد کے علاقے سے دور نکل جانا چاہیے۔ چنانچہ فٹ پاتھ سے اُٹھ کر جب اُس نے دوبارہ موٹر سائیکل کا اسٹینڈ ہٹا کر موٹر سائیکل کو کک مارنا چاہی تو اُس کے ہاتھوں اور پیروں سے دم نکل چکا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ موٹر سائیکل اس کے دونوں پیروں پہ آن پڑا۔ زمین پہ بے سُدھ پڑے ہوئے اُس نے ہلکی ہلکی دو چار آہیں لیں۔ اور پھر خاموش ہوگیا۔
ہوش آیا تو پھر سسکنے لگا۔ اسکی سسکیاں سن کر ایک ڈسپنسر اُس کے بستر سے ذرا دور ہو کے

بولا - اچھا ہوا تمہیں ہوش آ گیا - پولیس والے تمہیں یہاں چھوڑ گئے تھے - تمہارا موٹر سائیکل تھانے میں ہے - تم ٹھیک ہونے کے بعد اُن سے واپس لے لینا- اس نے سوجھے ہوئے چہرے کے ساتھ بات کرنے والے ڈسپنسر کو دیکھا- وہ عمر میں اُس سے دو چار سال چھوٹا تھا- سر پر سفید جالی دار ٹوپی- ہلکی داڑھی نکلی- کھلی آستینوں والی سفید قمیض اور سفید شلوار میں وہ اُسکا تماشہ کیے جا رہا تھا- پیٹر کو یوں لگا جیسے ٹھنڈی کنویں والی مسجد کے مولانا صاحب کا آدمی ہے- تمہیں زیادہ مسئلہ نہیں ہے - ڈسپنسر بولا- ڈاکٹر سب عید کی چھٹی پر ہیں- ایمرجنسی ہو تو ڈاکٹروں کو بلایا جا سکتا ہے - تم اپنے کرسچین ہسپتال میں کیوں نہیں جاتے کرسچین ہسپتال کا نام سنتے ہی - پیٹر کی آنکھوں کے سامنے ڈیوڈ کا چہرہ لہرا گیا- جس نے چند سال پہلے الیکٹریشن کی نوکری کے لیے کس طرح اپنے چھوٹے بھائی سموئیل کو بھرتی کروایا تھا - ہسپتال کے سارے عملے نے ڈیوڈ کا ساتھ دیا تھا- سارے ہسپتال میں ڈیوڈ جیسے لوگ تھے- جو صرف اپنوں کے لیے- اور خاص مفادات کے لیے کام کرتے ہیں- گزشتہ کئی سالوں سے اُس نے ہسپتال کے اندر پلنے والی چاپلوسیوں اور سازشوں کی وجہ سے ہسپتال جانا چھوڑ رکھا تھا- ڈیوڈ کا بھائی سموئیل عمر بھر رکشہ چلاتا رہا تھا- ایکسیڈنٹ کے بعد اُسے الیکٹریشن بھرتی کروانے میں ڈیوڈ نے کس مہارت سے پیٹر کا پتہ صاف کروایا تھا- حالانکہ وہ عمر اور قابلیت کے لحاظ سے اس کام کے لیے قابل نہ تھا- تم کیا جانو کرسچین ہسپتال میں کیسے کام ہوتا ہے- وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑایا - پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا- مجھے اپنا مسئلہ سمجھ آتا ہے- مجھے پتہ ہے میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے- گھر پہنچ کر- ٹھیک ہو جاؤں گا--- یہ کہہ کر اُس نے اپنے ٹانگیں لیٹے لیٹے بستر پر لٹکا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی- ڈسپنسر نے اُسے چھوا تک نہیں تھا- اُس کے پاؤں میں بوٹ ابھی تک موجود تھے- جن کے اندر کی گرمی اور نمی سے اُسے کوفت ہوتی جا رہی تھی، بستر کے سہارے کچھ دیر کھڑا رہا- پھر پاؤں آہستہ آہستہ گھسیٹتا ہوا وارڈ سے باہر نکل آیا- ڈسپنسر نے اُسے بے حسی سے دیکھتے ہوئے کہا- تم ٹھیک ٹھاک ہو- بس تھوڑا آرام کرنا ہے - وارڈ سے نکلتے ہوئے اُسے باہر جانے کا راستہ معمول نہ تھا- چونکہ وہ بے ہوشی میں اُٹھا کے لایا گیا تھا- چند ایک لوگ بڑی عجلت اور پریشانی میں اُس کے پاس سے گزرے تھے- وہ اتنا کمزور اور بے نیاز ہو گیا تھا کہ کسی کو روک کر راستہ پوچھ لینے کی جرأت بھی نہ کر سکا- الگ تھلگ کسی جزیرے کا باشندہ ہونے کو تسلیم کر چکنے کے بعد وہ اپنے ساتھ ہونے والے معاملات پر کوئی احتجاج اور مذمت

کرنے کی خواہش رکھتا تھا نہ جرأت۔ خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ ایک کھلے برآمدے میں پہنچا برآمدے کے فرش سے سیمنٹ کی تین چار سیڑھیاں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ سیڑھیوں سے اُترنے کے لیے پہلے زینے پہ پاؤں رکھنے لگا تو زینہ اُسے بہت نیچے گہرائی میں دکھائی دیا اُسے یوں لگا کہ غلط پاؤں رکھنے کی وجہ سے بہت نیچے جا گرے گا۔ اُسے اتنی گھبراہٹ اور حیرانی ہوئی کہ وہ رونے لگا۔ اور خود سے پوچھنے لگا یہ میں کونسی جگہ پر ہوں۔ اور نیچے اتنی گہرائی کیوں ہے۔ بے بس ہو کر اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کسی کو اپنا ہمدرد اور مدد گار نہ پا کر وہ برآمدے کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا کے اچانک جھونکے سے اُسے قدرے سکون ملا۔ اُس نے پاؤں پسار لیے۔ مٹی کے ریلے اُسے اپنے چہرے پہ پاؤں محسوس ہوئے۔ پھر دوڑتے ہوئے ایک آدمی کی آواز سن کر وہ گھبرا گیا۔ کمروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرلو۔ بہت تیز اور زوردار مٹی کا طوفان ہے، وہ خبردار اور چوکنا سے ہو کر کھڑا ہو کر لرزنے لگا، اُسے منیجر کا کمرہ یاد آ گیا۔ پریشانی اور ڈر سے اُس کا چہرہ بگڑ گیا۔ ایک چیخ گلا کر وہ دوبارہ سیڑھیوں کے درمیان آیا۔ اور خود کو حوصلہ دیتے ہوئے بولا، ہمت کرو منیجر کے کمرے کی کوئی کھڑکی کھلی نہ رہ گئی ہو۔ کہیں آیت الکرسی کا فریم نیچے نہ گر پڑا ہو۔ اس نے جنگ کے کسی آخری اور زخمی سپاہی کی طرح جیسے ہی سیڑھی پہ پاؤں رکھا تو اسکا توازن بگڑ گیا۔ بھاری جسم کو بے قابو ہوا تو وہ کراہتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گیا۔ اور وہیں بے جان سا ہو کر لیٹ گیا۔

بہت دیر کے بعد چند لوگ اُسے اُٹھا کر دوبارہ ایمرجنسی وارڈ میں لے آئے۔ نوجوان ڈسپنسر نے مذمت کرتے ہوئے حقارت سے کہا، اوہ ---اسے پھر لے آئے۔ یہ یہاں کا مریض نہیں ہے۔ ویسے بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایک سادہ سے آدمی بولا، دیکھ تو لیں، ڈاکٹر صاحب۔ اس کا پورا چہرہ نیلا ہو چکا ہے۔

اپنے لیے ڈاکٹر کا خطاب سن کر وہ پیٹر کے بے جان جسم کے قریب آیا۔ بے دلی اور احتیاط سے اس نے پیٹر کی نبض دیکھی۔ پھر آنکھ کی پتلیاں کھول کر دیکھیں۔ اور سر ہلاتے ہوئے وارڈ سے ملحقہ ایک اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے سرکاری ٹیلی فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑ کر نمبر ملایا تھوڑی دیر انتظار کے بعد وہ بڑی ذمہ داری سے بولا، سٹی تھانہ--؟ ایس۔ ایچ۔ او خالد صاحب ---اچھا جی۔ انہیں اطلاع دینی تھی کہ وہ ساڑھے چار بجے کے قریب ایک بیمار عیسائی پیٹر کو یہاں ہسپتال لائے تھے۔ جی۔ ان کو بتا دیں جی کہ وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میرا خیال کہ ایکس پائر ہو گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

گیدڑ سنگھی

غربت سے لڑتے فضل ہانپ سا گیا۔ بچپن سے ہی سن رکھا تھا کہ ایک پُراسرار سی چیز گیدڑ سنگھی ہوا کرتی ہے۔ جس کے پاس ہو اس کی قسمت کھل جاتی ہے۔ اس نے کئی بار گیدڑ سنگھی خریدی بھی اسے لونگ اور سیندھور میں رکھا۔ اس کے بال بھی بڑے ہوئے مگر دولت نہ ملی، ایک بار تو سپیرا اسے چاندی کی ڈبیا میں ہی دیتا گیا، مگر سب کچھ نقلی تھا ورنہ مالی حالات ہی کچھ بہتر ہوتے۔ ہن برسنا تو دور کی بات ہے۔ ضروریات ہی پوری ہوتیں تو بات تھی۔ وہی کھوکھا باپ کے بعد فضل چلا رہا تھا۔ ٹانگیں موڑ کر سمٹ سمٹا کر بیٹھ رہتا۔ گاہکوں کو پان اور سگریٹ دیتے ایک عمر بیت گئی۔ یوں تو سود حرام کے نعرے لگاتے مگر عالمی اداروں سے بھاری سود پہ قرض حاصل کرتے بیرون ملک جائیدادیں بناتے اور عوام سودی رقم ادا کرتے گھس گھسا گئے تھے۔ فضل کی شادی بھی نہ ہو سکی غربت کسی جادوگرنی کی جھاڑو کی طرح ساتھ ساتھ اڑتی پھرتی۔ اس کا کھوکھا دیکھ کر انکار کر دیا جاتا۔ غربت اس کی ماں کو بھی سمیٹ کر ساتھ ہی چھٹے وقت کے کنوئیں میں ڈال گئی باپ کے علاج کے پیسے نہ تھے۔ ہسپتال میں دوائیاں نہ تھیں۔ ساری رقم سرکار لے جاتی کہ اس سے توپ بم خرید کر ہم کفری طاقتوں کو خوب ماریں گے۔

حق کا بول بالا ہوگا۔ تینوں پڑوسی ملکوں سے باپ مارے کا بیر تھا اور گیدڑ سنگھی بھی نہیں مل رہی تھی۔ پڑوس میں ماسی رہتی تھی۔ دبلی پتلی سی تھی مرچ جیسی۔ کھنڈر بتاتے کہ کبھی عمارت عظیم رہی ہوگی اب تو یہ حالت تھی کہ جیسے سگریٹ کا خالی پیکٹ! جسے بے شمار لوگ روندتے نکل گئے ہوں اس کی شہرت اچھی نہ تھی مگر وہ میر محلہ تھی۔ بجلی نہیں آ رہی۔ پانی بند ہے گیس کا دباؤ کم ہے اس کے در پہ دستک دیتے۔ ماسی موبائل پہ جانے کس کس کو لتاڑ کے رکھ دیتی۔ اور کام ہو جاتا۔ اس کا شوہر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا دوستوں کے ہمراہ لڈو کھیلتا اور محلے بھر کو سر پہ اُٹھائے رکھتا۔ زور زور سے سگریٹ کے سوٹے مارتا۔ پرلے درجے کا ہڈ حرام اور تاوانی تھا۔

آغا گل

فضل سے سگریٹ بھی مفت ہی لیا کرتا۔ اہل محلہ کہتے کہ اس کے گھر میں ماسی کے علاوہ ہر چیز مفت کی ہے۔ کسی فوجی حکومت کی طرح ماسی ڈٹ کے رہتی لوگ باگ کہتے کہ شوہر کے ہمراہ بھاگی اور نکاح کر لیا۔ تبھی تو کوئی ملنے نہیں آتا اور نہ یہ کوئی عزیز رشتہ دار تھا جیسے زمین سے اُگ آئے ہوں سپاہیوں کی طرح جو بے تحاشہ زمین پہ اُگے آتے ہیں حالانکہ بلوچستان خوشکابہ ہے۔

گیدڑ سنگھی کے بارے میں فضل نے ایک بار ماسی سے بھی سوال کیا تھا کیونکہ بغیر کسی آمدنی کے اس کا گھر ٹھاٹھ سے چل رہا تھا۔

''ماسی_ تمھارے پاس بھی لگتا ہے کہ گیدڑ سنگھی ہے مزے سے رہتی ہو۔'' ماسی نے کش کھینچ کر دھواں فضل کے چہرے پہ مارا۔

''بس کیا کہوں گیدڑ سنگھی تو ہے مگر اب کرامات ختم ہو گئی ہے اسی کے کالے بال سفید ہو گئے گیدڑ سنگھی کی طرح۔ عمر نے میری گیدڑ سنگھی بھی بے کرامات کر دی۔''

فضل نے گیدڑ سنگھی کو اتنے سیندور میں رکھا تھا کہ گیدڑ سنگھی کے سفید بال سیندھوری ہو گئے مگر ایک روپیہ بھی نہ ملا۔ وہ سنیاسی بھی کہیں کھسک گیا تھا ورنہ رقم کا تقاضا کرتا۔

یوں تو بہت سے ان نرالی چیزوں کو خوش قسمتی کا سبب قرار دیا کرتے جیسے لعل یا منکہ انگریز بھی سنا تھا کہ گیدڑ سنگھی کو جیکال ہارن کہتے اور اپنے پاس رکھتے کچھ تو طلسم تھا ہی۔

''ماسی! تم اتنے تعلقات والی ہو مجھے اصلی گیدڑ سنگھی تو لا دو۔ زندگی بھر غلام رہوں گا۔ سگریٹ پان سب کچھ مفت دوں گا۔''

فضل نماز میں بھی دعا کیا کرتا کہ کسی طرح گیدڑ سنگھی مل جائے تو سارے دلدر ہی دور ہو جائیں سرکار چکلے کے دلال سی کفن کش تھی اس کا پیٹ ہی نہ بھرتا۔ ایک روز ماسی خوشی خوشی چلی آئی۔ ''فضل تمھاری شادی کرا رہی ہوں۔ لڑکی اس قدر خوب صورت ہے کہ پاگل ہو جاؤ گے، سمجھو کہ لاٹری نکل آئی ہے۔ گیدڑ سنگھی مل گئی ہے۔'' فضل نے آہ بھر کے اپنے مکان اور مکانیت پر نظر دوڑائی۔ ''ایک کھوکھے والے کو خوبصورت بیٹی کون دے گا۔''

ماسی بدستور جذباتی تھی۔ ''وہ تیار ہیں تم ہاں کہدو۔'' فضل نے بے یقینی سے ہاں کہدی۔

ماسی نے موبائل نکالا ''جادو ڈکر کارڈ لے آ۔ ایک ہزار روپے کا۔'' فضل پل بھر میں کارڈ لے آیا۔ ماسی نے رقم ڈالی اور ادھر ادھر فون دوڑانے لگی۔ یہی نہیں بلکہ جمعہ کے روز نکاح بھی طے کر دیا۔ فضل سر پکڑ کے بیٹھ گیا ''ماسی واقعی تمھارے پاس گیدڑ سنگھی ہے۔ کیا جادو ہے۔ دیکھے بغیر ہی رشتہ طے ہو گیا۔ کیا تنتر منتر ہے تمھارا۔''

سارے محلے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ماسی بہت خوش ہوئی ''کوئی تمھاری قسمت اچھی ہے۔ لڑکی کا باپ قتل کیس میں تھا۔ اسے عمر قید ہو گئی۔ ماں پہلے چل بسی غریب کا تو رشتے دار بھی نہیں ہوتا۔ باپ کہتا ہے کہ کسی شریف آدمی سے بیاہ دوں میں نے تمھاری ذمہ داری لی ہے۔ اب میرے غلام بنے رہنا۔''

فضل اس کے پیروں پہ جا گرا۔ ماسی جانے کس کس سے چار کاریں لے آئی محلے کی چند عورتیں اور مرد دولہا کے پھولوں سے سجی کار۔ فضل نے بھی ساری رقم ماسی کے حوالے کر دی۔ شادی کے بعد وہ دلہن کو گھر لایا۔ ماسی نے دلہن کے چہرے سے چادری اُٹھا کر رونمائی کی تو فضل دل تھام کر ڈھیر ہو گیا۔ اس قدر حسین عورت اس نے کبھی نہ دیکھی تھی کس سمگلڈ سگریٹ کے پیکٹ کی طرح رنگین چمکتی دمکتی کہ ہاتھ لگانے سے ہی میلی ہو جائے۔ لگتا تھا دلہن کے اندر جاپان کی ایل سی ڈی بتیاں لگی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں چمک رہی تھی۔ فضل کا دل تو چاہا کہ ماسی کے قدموں میں جا گرے۔ عورت کیا فرشتہ تھی بلکہ فرشتی۔ دلہن حریم اگرچہ غریب گھرانے سے تھی۔ باپ نے کس ٹاٹ پر بوتل مار کر جواری کا سر توڑ دیا تھا اور خود بندی خانے سدھارا۔ حریم تو گھر میں گویا چاند سی دمک رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں گھر سنبھال لیا۔ ایک نئی بات کا پتہ چلا کہ حریم کو فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ اور شوق بھی ایسا کہ سینما میں بیٹھ ہی جاتی۔ تین سے چھ اور چھ سے نو فلم زیادہ پسند آتی تو آخری شو دیکھ کر ماسی کے ہمراہ کھڑ کھڑاتے رکشے میں چلی آتی۔ فضل کو کچھ ناگوار گزرا۔ مگر ماسی نے یقین دلایا کہ رفتہ رفتہ سنبھل جائے گی۔ باپ عمر قید میں گیا، گھر کی غربت پریشان کیے دیتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ چھوڑ کر ہی چلی جائے۔ فضل کا چہرہ اُتر گیا۔ ایسی حسین رسیلی دریشکو کے سیبوں جیسی آب گم کے بیروں جیسی! اس نے سوچا فلم دیکھ کر ممکن ہے کہ غم غلط کرتی ہو۔ یہ بھی ارادہ کیا کہ رقم ہاتھ لگے تو گھر میں ہی ٹیلی ویژن لگا دے یہ بڑا سا سینما جیسا۔ اکبر سیٹھ جانے کس ترنگ میں تھا کہ بجائے ملازم کے خود گرینڈ کروزنگ سے نکل آیا۔ اور چار کارٹن پسندیدہ سگریٹ کے طلب کیے۔ کھوکھے میں تو احتراماً اُٹھنے کی گنجائش ہی تھی فضل سریاب کے بس کے مسافر کی طرح بس ہل کر رہ گیا۔

''سیٹھ صاحب چار پیکٹ ہیں۔ کارٹن کی طاقت کہاں ہے۔ غریب آدمی ہوں۔

''لجاجت سے منمنایا۔ سیٹھ نے صدری میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا بنڈل اچھال مارا۔ ''یہ لے! کل میرے سگریٹ نہ ہوئے تو میرے ہاتھوں وہ حال ہوگا کہ یاد کرے گے۔'' سیٹھ کچھ زیادہ ہی روسی وڈکا چڑھا چکا تھا۔ یہ بھی نہ بتلایا کہ کیا یہ رقم بیعانہ ہے یا کہ ادھار۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹ بہار دکھا رہے تھے۔ پانچ لاکھ! وہ کانپ کانپ گیا۔ ہاتھوں میں رعشہ سا آ گیا۔ ہاتھ پہ کاٹ کے دیکھا سچ تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ یہ خواب نہ تھا۔ حریم ہی گیدڑ سنگھی تھی۔ اس نے رقم حریم کے قدموں میں رکھ دی میں تو زندگی بھر گیدڑ سنگھی ڈھونڈتا رہا۔ تم میری گیدڑ سنگھی ہو۔ تمھاری قسمت میری تقدیر سے جا ٹکرائی ہے۔ یہ رقم سنبھالو۔''

حریم نے رقم رکھ لی۔ ''اگر تم مجھے خوش رکھو گے تو میں دعائیں مانگ مانگ کر ہی تمھیں امیر بنا دوں گی۔'' اگلی شام سیٹھ اکبر ترنگ

میں آیا۔ سگریٹ مانگے۔ اس کے سکیورٹی گارڈز گاڑی کے ساتھ ہی کھڑے رہے۔
''کل جو آپ نے مجھے رقم دی تھی وہ۔۔۔''
فضل نے بولنا چاہا تو سیٹھ نے ہاتھ کے اشارے کے روک دیا۔ ''کل میں ٹن تھا زیادہ پی گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔'' فضل کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر وہ دھواں اُڑاتا چلا گیا۔ منرل واٹر کی پلاسٹک کی بوتل میں وڈکا یا جن ملا کر وہ سرعام پیتا چلا جاتا اور لوگوں کو علم نہ ہو پاتا۔ اس کا نشہ فضل کے لیے نعمت ثابت ہوا۔
یہ بھی قسمت کی ہی بات ہے کہ ملک باران کو فضل پہ ترس آیا۔
''فضل کیا اس بوتوں کے ڈبے میں بیٹھے رہتے ہو'' فضل نے گلوگیر لہجے میں درد بھری کہانی سنائی کہ باپ کے بعد غربت نے اسے تاک رکھا ہے۔ ملک ایک رحم دل انسان تھا اس نے اپنی مارکیٹ میں ایک بڑی سی دکان دے ڈالی اور اچھی خاصی رقم بھی دی کہ مختلف قسم کا سامان رکھے۔ ملک میں مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ زندگی کے علاوہ ہر چیز مہنگی ہوئی جاتی تھی۔ ''فضل تم کفن، اسلحہ یا کھانے پینے کی چیزیں رکھو۔ یہاں یہی بکتا ہے۔ لوگوں کا دل جلتا ہے کڑھتے ہیں سگریٹ کے بغیر ہی ان کا سینہ جلتا ہے۔ یوں بھی سگریٹ کے خلاف مہم چل رہی ہے۔ تم کاروبار بدل لو۔'' فضل کو مشورہ پسند آیا۔ سیٹھ اکبر کو علم ہوا تو اس نے بلوا بھیجا۔ ''افسوس تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔ کاروبار بدلا اچھا کیا، کچھ مدد ہی لے لیتے۔'' اتنا بڑا آدمی بچھا جاتا تھا۔ پھر اس نے ایک بڑی رقم فضل کے حوالے کر دی۔ ''یہ مدد ہے! ادھار نہیں۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ دوسرے مسلمان بھائی کا خیال رکھے۔''
فضل کو کیٹرنگ کے آرڈر بھی ملنے لگے۔ اس نے محلے کو خیر آباد کہا لیکن ماسی سے تعلقات بدستور رکھے۔ جب وہ امیروں میں جاتا تو خوشی نہ ہوتی۔ اسی محلے کے غریب غرباء، سے مل کر خوشی ہوتی جواب اس کا نام عزت سے لیا کرتے۔ حریم ایک نہایت ہی شریف بیوی ثابت ہوئی۔ پردے کا خاص خیال رکھتی۔ ہمیشہ سر ڈھانپے رہتی۔
فضل نے کار دلوا دی تھی ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی ماسی بطور محافظ کے ساتھ ہی رہتی۔ سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی۔ اتنی دولت کے باوجود حریم میں رعونت نہ آئی۔ ویسی ہی ہنس مکھ اور ملنسار تھی۔ دولت سے وہ اور بھی نکھر گئی، حسین لباس، زیورات، بڑھیا خوشبوئیں، کسی شادی بیاہ میں جاتی تو کشتوں کے پشتے لگا دیتی عابد وزاہد بھی دل تھام کے رہ جاتے۔ فضل پر رشک کرتے کہ کیا قسمت پائی ہے۔ بعض دل جلے تو حریم کو ہی گیدڑ سنگھی کہتے جس نے ایک کھوکھے والے کو دیکھتے ہی دیکھتے صاحب حیثیت بنا دیا۔ ماسی اسے حسن قائم رکھنے کے گُر سکھاتی۔ ہفتہ وس روز میں بیوٹی پارلر لے جاتی۔ ماسی تو اس کی ہم زاد تھی۔ لیکن

فضل کے آتے ہی وہ ماسی سے گفتگو بند کرکے پوری توجہ فضل کو ہی دیتی۔ ایک وفاشعار بیوی کی طرح بچھی جاتی۔ جس کے باعث فضل کو ماسی کی کوئی خاص اہمیت محسوس نہ ہوتی۔ حریم کا باپ تو جیل کی صعوبتیں برداشت نہ کرسکا۔ کالا گیٹ اسے زندہ نگل گیا تھا اناکونڈا کی مانند۔ حریم کی زندگی میں فضل کے بعد بس ماسی ہی بچی تھی۔ ورنہ تو وہ اس بھری دنیا میں بالکل ہی اکیلی تھی۔ قدرت نے دو بیٹے بھی دیئے اور جب سنہری بالوں، نیلی آنکھوں والی بیٹی پیدا ہوئی تو خاندان مکمل ہوگیا۔ ڈاکٹر ہی نے فضل کو بتلایا تھا کہ حیرت کی بات نہیں ہے۔ جینز کا بھی عجب کام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین سو برس قبل کوئی نیلی آنکھوں سنہری بالوں والی نانی پڑدادی۔ نکڑدادی رہی ہو جس پہ چلی گئی۔ جیسے کہ ایک شہزادی کے ہاں کالا بھجنگ بچہ پیدا ہوا تو ڈاکٹروں نے آگاہ کیا تھا کہ چونکہ شہزادی اپنے غلاموں کو دیکھا کرتی۔ دماغ کی وہ تصویر اصل بچے کے روپ میں آگئی۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ ماؤں کو حبشیوں سے دور رکھا جائے۔

فضل کو لگتا کہ زندگی مکمل ہوگئی ہے۔ اس نے جس قدر سوچا تھا کہیں بڑھ کر اسے ملا پہلے تو وہ صرف مغرب کی نماز ہی باجماعت ادا کرتا کاروبار میں وقت ہی نہ ملتا۔ اب تو منشی بھی تھا۔ ملازم بھی۔ وہ فجر اور ظہر بھی باجماعت ادا کرنے لگا۔ سیٹھ اکبر اور ملک باران کے علاوہ شہر کے دیگر روساء سے بھی فضل کے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ کوئٹہ کلب کے ممبر بھی بن گیا۔ اسے بتلایا گیا تھا کہ کنگ میکر وہیں آکر بیٹھتے ہیں۔ اس سے میل جول کے باعث کیا عجب کہ کبھی وزیر یا مشیر ہی لگا دیں۔ اقتدار کی دیوی کوئٹہ کلب میں رہتی تھی نالے کے اس پار!

انہی دنوں ایک معروف ایسٹرو پامسٹ شہر میں آیا تو قسمت کا حال جاننے والے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ فضل کو نجومی فراڈ لگے" کہ ہاتھ کی لکیریں اور ستاروں کی چال سے قسمت ہی بتادیں، توبہ توبہ فضل گال پیٹ لیتا۔ کیسے کفر بکتے ہیں۔

بابل کی طرح یہ شہری بھی الٹا نہ ہوجائے وہ من ہی من میں کانپتا رہتا۔ ایک مربی کے اصرار پہ وہ بھی بادل نخواستہ چل پڑا۔ نجومی ایک بڑھیا ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس سے ملنے کا باقاعدہ وقت لیا جاتا۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ نجومی نے کھلے دل سے استقبال کیا۔

اس کے مربی کا ہاتھ دیکھا، معلومات حاصل کیں کہ کب کہاں کس شہر میں پیدا ہوا۔ اس کا مربی زائچہ پیدائش بنوانا چاہتا تھا جس کی فیس بھی زیادہ تھی، نجومی نے تین روز کا وقت مانگا۔ فضل محض تفریحاً ہی نجومی کے ساتھ آبیٹھا ہاتھ دکھایا وقت پیدائش وغیرہ۔ طوطے کی طرح رٹے رٹائے الفاظ میں پوچھا۔

"کیا کریں، روپیہ پیسہ، عزت دولت ہے مگر قسمت میں اولاد نہیں ہے۔" نجومی نے

تاسف سے سر ہلایا۔ فضل کا قہقہہ گونج اٹھا اگرچہ وہ باآواز بلند ہنسنے سے خود کو روکے رکھتا کہ متانت کے خلاف ہے۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ نجومی کو حقارت سے دیکھا

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ سب فراڈ ہے نجوم شجوم۔ میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ کیا لا کر بھی دکھاؤں۔''

نجومی کا چہرہ فرط جذبات سے سرخ ہو گیا۔ مگر اس نے جذبات پہ قابو پا لیا۔ ایک گلاس پانی بھی حلق میں انڈیل لیا۔

''یہ ہزاروں برس قدیم علم ہے۔ آپ میرا مذاق اڑا لیں مگر علم کی تحقیر نہ کریں'' یوں تو نجومی مفاہمت پہ اتر آیا تھا، مگر کھول رہا تھا۔ فضل کے اندر کا کھوکھے والا جاگ اٹھا

''کیوں نہ کروں میرے شہر والوں کو الو بنانے والے کا میں کیا ادب کروں۔ آپ سے تو فال نکالنے والا طوطا ہی بہتر ہے۔ جو ایک مونگ پھلی لے کر خوش ہو جاتا ہے۔'' نجومی کو کمزور پا کر فضل اور بھی شیر ہو گیا ملبہ ہی ڈال دیا۔

نجومی کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ دونوں دست و گریبان ہونے کو تھے۔ کندھے تول رہے تھے ''بہتر ہے کہ میرے شہر سے چلتے بنیں۔'' نجومی نے دراز کھول کر پانچ ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور فضل کو دیا۔

''جائیں اپنا ٹیسٹ کرائیں یہ پتھالوجسٹ کی فیس ہے۔ رزلٹ لے کر سیدھا میرے پاس آئیں۔ میں نہ صرف چلا جاؤں گا بلکہ یہ کام چھوڑ دوں گا۔ ورنہ پھر چلتے پھرتے نظر آنا۔''

فضل نے گھڑی دیکھی ''میں ابھی واپس آتا ہوں۔ آپ اپنا بوریا بستر باندھ لیں۔'' فرط غضب سے دونوں پاگل ہوئے جاتے تھے اس کے ڈاکٹروں سے کافی تعلقات تھے۔ پتھالوجسٹ شام میں اپنی پریکٹس کرتا اسکا ایک بڑا نام تھا۔ اس نے فضل کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ''اس کو زیادہ وقت نہیں لگے گا میں بھی جلدی کروں گا پھر بھی ایک گھنٹہ تو لگے گا ہی۔'' مشینوں سے جانچا۔

فضل نے Specimen دیا، بڑا ہی غیر شاعرانہ انداز تھا اسے ندامت بھی ہوئی، مگر سوال اس کی آن کا تھا ضد کا تھا، فیس ادا کر کے وہ کلینک سے چلا گیا، رش کے باعث کچھ دیر بھی لگی۔ اسکا لفافہ تیار پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے لفافہ دینا چاہا تو اس نے لوٹا دیا۔

''میں اتنا پڑھا لکھا نہیں آپ ہی نتیجہ بتا دیں۔'' ڈاکٹر نے بے چینی سے پہلو بدلا، وہ گڑبڑا سا گیا۔ جیسے وہ مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔

''آپ کی رگیں پیدائشی طور پر بند ہیں Sperm Release نہیں ہوتے اس قدر باریک آپریشن شاید امریکہ میں ہو سکے تبھی آپ صاحب اولاد ہوں گے۔''

☆☆☆☆☆

ٹاٹ _ جوئے کی چادر

ٹینچو _ نوٹوں کی گڈی

''غازی''

سرسراتی ہوئی زناٹے دار گولی اُس کے بازو کو چیرتی ہوئی آر پار ہوگئی تھی...
اور ساتھ ہی درد کی ایک تیز لہر غازی احمد کو جیسے اپنے پورے وجود میں اترتی محسوس ہوئی تھی- لیکن اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے اور اپنی بھاری بھرکم ایس ایم جی کا رخ دشمن کی طرف کرتے ہوئے اس نے پھر سے اپنی پہلے جیسی پوزیشن سنبھال لی.....

اگلے ہی لمحے دشمن کی طرف سے فائر ہوئی لاتعداد گولیاں غازی احمد کے سر کے اوپر سے گزر گئیں...

غازی نے اپنے ایمونیشن اسٹاک کی طرف دیکھا جو کہ مسلسل دو گھنٹے سے دشمن کے خلاف استعمال ہو کر اب بہت محدود رہ گیا تھا-

اس اچانک حملے میں چار ساتھی جام شہادت نوش فرما چکے تھے- کتنے خوش نصیب تھے جو اپنی منزل پا چکے تھے اور شہادت جیسے عظیم رتبے پر فائز ہوگئے تھے- اس نے رشک بھری نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے اللہ اکبر کا بلند و بانگ نعرہ لگاتے ہوئے ایک پورا برسٹ سامنے سے چھپ کر آتے دشمن فوجیوں پر خالی کر دیا- شاید وہ اپنی دانست میں پاکستانی چوکی کو فتح کر چکے تھے تبھی فائرنگ میں پانچ منٹ کے وقفے نے ان کو اپنے مورچے سے باہر نکلنے کا حوصلہ دیا تھا-

اچانک ہونے والے اس جوابی کارروائی کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھے تبھی ایک ساتھ تین دشمن فوجی جہنم واصل ہوگئے تھے- لیکن اس کے ساتھ ہی دشمن مورچے میں موجود باقی فوجیوں کی طرف سے فائرنگ میں مزید شدّت آگئی تھی-

غازی احمد ..... کیپٹن عبدالقوی نے چلا کر کہا

یس سر!!!! اس نے پورے جذبے سے اپنے آفیسر کو جواب دیا...

ہم اکیلے زیادہ دیر اپنی اس چوکی کو نہیں

لبنیٰ مقبول

سنبھال سکیں گے- دشمن نے اس بار پوری منصوبہ بندی سے حملہ کیا ہے- ہماری سب سے نزدیکی چوکی سے فوجی کمک آنے میں مزید ڈیڑھ گھنٹہ لگ سکتا ہے- اس سب میں تشویش ناک بات یہ ہے کہ موسم بھی مسلسل خراب ہوتا جا رہا ہے-

یس سر..... غازی احمد مسلسل جاری گولیوں کی بوچھاڑ میں ان کی بات کو بغور سن رہا تھا-

باقی دونوں ساتھی جوان اللہ دتہ اور دین محمد بہت چابک دستی سے اپنی پوزیشنیں سنبھالے دشمن پر نظر رکھے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے جوابی فائرنگ کر رہے تھے-

یہ چوکی بہت اہم بھی ہے لیکن مزید کمک آنے تک ہمیں وقتی طور پر چوکی خالی کرنا ہی ہوگی-

ہمیں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پیچھے کی طرف کسی محفوظ مقام تک پہنچنا ہوگا-

کیپٹن عبدالقوی کے کاندھوں پر اپنے جوانوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی تھی جس کے تحت انہوں نے یہ مشکل فیصلہ لیا تھا-

سر..... غازی احمد نے ایک لمحہ سوچا...

اور پھر اپنی چوکی پر شان و شوکت سے لہراتے ہوئے سبز ہلالی پرچم کو نہایت عقیدت سے دیکھا اور وطن کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کے اندر ایک بار پھر لہو بن کر دوڑ گیا-

ہم کچھ دیر مزید ان بزدلوں کو الجھا کر رکھ سکتے ہیں سر!!!

آپ وائرلیس پر ہیڈ کوارٹر کے ساتھ رابطے میں رہیں.....

ہم آخری سانس تک لڑیں گے-

اگر اللہ نے چاہا تو پاک چوکی پر دشمن فوجیوں کے ناپاک قدم نہیں رکھنے دیں گے...

ہماری یہ چوکی ان لوگوں کے لیے ہمیشہ کی طرح ان شاءاللہ اس بار بھی ناقابلِ تسخیر ہی رہے گی- انہیں اس بار بھی ناکام و نامراد واپس لوٹنا ہوگا-

غازی احمد کی بات سن کر کیپٹن عبدالقوی کے چہرے پر ایک فخریہ مسکراہٹ آ گئی- ان کی ٹانگ میں بھی ایک گولی لگ چکی تھی جس کی پرواہ کیے بغیر وہ مسلسل اپنے ساتھیوں کو احکامات جاری کر رہے تھے-

جس ملک کی فوج کے جوان جذبہ حب الوطنی اور ایمان کی قوت سے سرشار ہوں، جو دل میں شہادت کا شوق لے کر دشمن کے آگے سینہ سپر ہوں وہاں پسپائی کیسے ممکن ہے بھلا-

ٹھیک ہے غازی احمد..... ہم یہیں رک کر مقابلہ کریں گے..... آخری سانس تک.....

انہوں نے غازی احمد کی تائید کی تو ساتھ ہی دونوں فوجیوں نے بھی جوش سے نعرہ تکبیر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور دوبارہ سے دشمن کے آگے سینہ سپر ہو گئے-

ایک اور دشمن کو تاک کر نشانہ لگا کر ڈھیر

کرتے ہوئے غازی احمد کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی...

ماں نے بڑے ارمانوں سے نام غازی احمد رکھا تھا...... لیکن غازی احمد جذبہ شہادت لیے بڑا ہوا تھا......

غازی احمد کے والد صوبیدار تھے... اور 1971 کی مشرقی پاکستان کی جنگ میں دشمن کے خلاف بہادری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر چکے تھے...... والد کی شہادت کے ٹھیک چار مہینے بعد غازی احمد پیدا ہوا تھا...... نام تو ماں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ شوہر وطن کی سلامتی کے لیے اپنی جان نچھاور کر کے شہید ہوا تھا تو بیٹا غازی بن کر بڑا ہوگا...... ماں نے دوبارہ شادی کر کے گھر بسانے کے بجائے شہید کی بیوہ بن کر باقی ماندہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا- پاکستان سے محبت تو جیسے ماں نے بس گھٹی میں ڈال کر پلا دی تھی- وہ وطن کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا اور پاک فوج سے محبت تو جیسے اُس کی نس نس میں رچی بسی ہوئی تھی......

اُسے ابھی بھی اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں گاؤں کے ایک بچے کا سر اس نے صرف اِس لیے پھاڑ دیا تھا کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے پڑوسی ملک کے ڈرامے کا ایک زہریلا ڈائیلاگ بولا تھا جو پاک فوج کے خلاف تھا- پورا گاؤں غازی احمد کے گھر پر جمع ہو گیا تھا اُس کی شکایت لے کر، لیکن جب اصل وجہ پتہ چلی تو سب وہاں سے چپ چاپ واپس لوٹ گئے تھے- غازی احمد کے شہید والد پر پورے گاؤں کو فخر تھا... وہ ایک سچے محب وطن پاکستانی کا گھر تھا تو اس گھر کا بیٹا کیسے پاک فوج کے خلاف کچھ سن سکتا تھا-

اسے یاد تھا کہ اُس رات ماں کی نماز غیر معمولی طویل ہو گئی تھی... اور وہ چپکے چپکے دُعا میں اپنے رب سے بہت شدت سے کچھ مانگ رہی تھیں...... بہت کوشش کرنے پر کچھ بے ربط سے الفاظ غازی احمد کے کانوں سے ٹکرائے تھے......

"شہید کی بیوہ...... یارب... جنت... مقام... شہید کی ماں"

یہ سب سنتے سنتے اُس رات غازی خود کو پاک فوج کی وردی میں دشمن کے خلاف مورچہ زن دیکھتے ہوئے نیند کی وادیوں میں چلا گیا تھا-

پھر جیسے جیسے غازی احمد بڑا ہوتا گیا تو ماں کی طرف سے منتقل شدہ پاکستان اور پاک فوج سے عشق نے اس کو بالآخر پاک فوج میں شمولیت کا راستہ دکھایا- اور اس دن ماں کی خوشی دیدنی تھی جب غازی احمد اپنی فوجی ٹریننگ مکمل ہونے پر گھر واپس آ کر اپنے شہید باپ کی برسوں پرانی وردی پہن کر اپنی ماں کے سامنے سیلوٹ کرتے ہوئے کھڑا تھا-

دو سال کے عرصے میں غازی احمد کی

پوسٹنگ مختلف جگہوں پر ہوتی رہی اور اپنی کارکردگی سے جلد ہی اس نے سب سینئرز کی نظروں میں ایک مقام بنا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے مہینے غازی احمد کی پوسٹنگ لائن آف کنٹرول کی اس اہم چیک پوسٹ پر کی گئی تھی۔

دفاعی لحاظ سے اس چیک پوسٹ کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اور دشمن فوج باوجود کئی بار کوششوں کے ادھر قبضہ نہیں کر پائی تھی۔ یہ چیک پوسٹ کافی اونچائی پر تھی اور یہاں تک پہنچنا دشمن کے لیے اتنا آسان نہیں تھا اسی لیے دشمن نے ہمیشہ منہ کی کھائی تھی لیکن اس بار دشمن نے رات کی تاریکی اور خراب موسم کے باوجود بھرپور حملہ کیا تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ جن فوجیوں کے دلوں میں وطن کی محبت کی گرمی ہو تو سرد اور خراب موسم بھی ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں لا سکتا۔

دین محمد!!!!

یس سر..... دین محمد اپنی جگہ پوزیشن لیے ہوئے پوری طرح مستعد تھا اور وقفے وقفے سے فائر کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

اسلحہ ختم ہونے کو ہے... اب سنبھل کر... ہمیں کسی بھی طرح یہ وقت گزارنا ہے.....

کیپٹن عبدالقوی نے دین محمد کو صورتحال سے آگاہ کیا.....

بے فکر رہیے سر.....

ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا..... دشمن کے فوجی پھر اپنی جگہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے دکھائی دیے... شاید آج انہوں نے جیت کا جشن منانے کا کوئی خواب دیکھ رکھا تھا تبھی ایک کے بعد ایک اپنی چیک پوسٹ چھوڑ کر آگے کی طرف پیش قدمی کرنے کی تین بار کوشش کر چکے تھے..... انہیں بھی شاید جوابی کاروائی میں کمی آنے سے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ پاکستانی پوسٹ پر اب وہ بات نہیں اور وہ اسی وقت کے انتظار میں تھے کہ ایک بھرپور حملہ کر کے چیک پوسٹ قبضے میں لے لی جائے۔

صورتحال خطرناک تھی اگر ان کو ادھر ہی نہ روکا جاتا تو پھر مزید روکنا ممکن نہیں رہتا۔

اللہ دتہ!!!! کتنا اسلحہ بچا ہے؟

کیپٹن عبدالقوی نے تشویش سے پوچھا۔

سر اسٹاک محدود ہے.....

بس پندرہ بیس منٹ اور نکال سکتے ہیں۔

کیپٹن عبدالقوی کے چہرے پر فکر کی لہر دوڑ گئی۔

وہ مسلسل مدد کے لیے آنے والے فوجیوں کے ساتھ رابطے میں تھے اور ان کو اس نازک صورتحال سے آگاہ کرتے جا رہے تھے۔

فوجی کمک اب تقریباً چالیس منٹ کے فاصلے پر تھی۔

وقت کا یہ فرق پوری صورتحال تبدیل کر سکتا تھا اور اس چوکی پر قبضہ پیچھے سے آنے

والے فوجیوں کو بھی مشکل میں ڈال سکتا تھا
اس صورت میں مزید بھاری جانی نقصان کا
اندیشہ تھا۔
تبھی شہادت کے جذبے سے سرشار غازی
احمد نے ایک فیصلہ لیا۔
دونوں چوکیوں کے بیچ کچھ فاصلے پر موجود
رابطہ پل کو اڑانے کا۔
پاکستانی چیک پوسٹ سے کچھ دور پرانا لکڑی
کا شکستہ یہ عارضی رابطہ پل دونوں چوکیوں
کے بیچ موجود تھا۔ پاکستانی علاقے میں
رسائی حاصل کرنے کے لیے برسوں پہلے
دشمن فوجیوں نے اس عارضی رابطہ پل کی
تعمیر کی تھی لیکن اس کو پار کرنے کی ان کی
حسرت محض حسرت ہی رہ گئی تھی۔
یہاں تک دشمن کی نظروں میں آئے بغیر
پہنچنا آسان نہیں تھا لیکن اسی پل کے اختتام
پر دشمن فوجیوں نے اپنی چیک پوسٹ بنا رکھی
تھی اس پل کے ختم ہونے کی صورت میں
ایک لمبے عرصے تک پاکستانی چوکی محفوظ ہو
جاتی اور دشمن کا، فتح کا خواب خاک میں
مل جاتا۔
سر...... غازی احمد نے کیپٹن عبدالقوی کو
اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔
ہمارے پاس اس کے علاوہ اب کوئی راستہ
نہیں کہ دشمن کے فوجیوں کو اپنی چوکی سے
آگے نکل کر جہنم واصل کیا جائے۔ وہ اس
بات کے لیے تیار نہیں ہوں گے اور میں اُن
کی اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پل
کو اڑا دوں گا۔
اب ہمیں یہ رابطہ پل اُڑانا ہی ہوگا سر!!!
غازی احمد نے پرجوش انداز میں کہا۔
لیکن غازی احمد ...... یہ معمولی بات نہیں
ہے۔
اُن کے علاقے میں اُن کی نگاہوں میں
آئے بغیر یہ ممکن نہیں... اس میں جان بھی
جا سکتی ہے اور میں تمہیں اس بات کی بالکل
بھی اجازت نہیں دے سکتا۔
کیپٹن عبدالقوی نے اپنی تشویش کا اظہار
کرتے ہوئے غازی کے اس پلان کی
نفی کی۔
لیکن وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ آخری صورت
میں بجز اس کے کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔
اب صرف آدھے گھنٹے کا فرق تھا لیکن یہ
آدھا گھنٹہ بہت اہم تھا...... سب کچھ بدل
جاتا... اس چوکی کی جغرافیائی اہمیت کے
تناظر میں۔
سر آپ معاملے کی نزاکت کو دیکھیں۔
مجھے اپنی جان کی قطعاً پرواہ نہیں......
اپنے پاک وطن کے لیے میں اپنی ایک تو
کیا دس جانیں بھی قربان کر سکتا ہوں۔
غازی نے فرطِ جوش سے کہا۔
ٹھیک ہے...... کیپٹن عبدالقوی نے بھی لمحوں
میں فیصلہ لیا...
اللہ دتہ اور دین محمد تم ان لوگوں کو الجھا کر
رکھو۔
میں سامنے سے غازی کو کور کروں گا اور

ہمارے پاس جتنے ہینڈ گرینیڈ اور جتنا بھی بارود بچا ہے وہ غازی کو دے دو۔ آج دشمن کو رس ملائی کھلانے کا وقت آ ہی گیا ہے۔

اور پھر اگلے پانچ منٹ میں غازی بارود سے بھرا بیگ اپنی پیٹھ پر لادے آگے بڑھنے اور دشمن کو مزا چکھانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

سر... غازی احمد نے کیپٹن عبدالقوی کو مخاطب کیا۔

میری ماں کو میرا اسلام کہنا..... ان کو کہنا کہ میں بابا کے ساتھ ان سے جلد ہی جنت میں ملوں گا۔

کیپٹن عبدالقوی نے غازی احمد کو آگے بڑھ کر بھینچ لیا اور گرمجوشی سے الوداع کہا۔

وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے جا رہا تھا، وہ ایک ایسی راہ کا مسافر تھا جس کی تمنا ہر مسلمان اپنے دل میں رکھتا ہے۔

وہ جس کا سفرِ آخرت کروڑوں لوگوں کی زندگی کا ضامن تھا۔

وہ جا رہا تھا، حیاتِ جاوداں کے لیے، شہید ہو کر ہمیشہ کی زندگی پانے کے لیے.....

وقت کم تھا اور غازی احمد کو چوکی کی پچھلی طرف سے نکل کر نظروں میں آئے بغیر، رینگتے ہوئے اور دشوار گزار ٹیلوں کا سہارا لیتے ہوئے اُس رابطہ پل تک پہنچنا تھا۔

مخالف سمت سے آتی تیز چکراتی یخ بستہ ہوائیں سوئیوں کی طرح جسم میں چبھ رہی تھیں، لیکن غازی احمد اپنے زخمی بازو کی پرواہ کیے بغیر آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

پاکستانی چیک پوسٹ کی طرف سے فائرنگ کا وقفہ بڑھتا جا رہا تھا... شاید دشمن کو بھی سمجھ آ رہی تھی کہ اب بس ایک بھرپور حملے کی ضرورت ہے... دشمن کی طرف سے فائرنگ میں شدت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

بس بیس منٹ.....فوجی کمک کے پہنچنے میں...

غازی احمد تقریباً پل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر اس کو اس پل پر یہ سب بارود نصب کرنا تھا۔

موسم مزید خراب ہو رہا تھا..... برف باری تیز ہو چکی تھی اور جسم کے اندر لہو جیسے جم سا گیا تھا۔

ایک ایک قدم آگے بڑھانا بہت اذیت ناک ہو رہا تھا، لیکن غازی احمد جذبہ ایمانی اور دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملانے کے بھرپور جذبے سے سرشار تھا جو اس کے بدن کو اس شدید خون جماتی سردی میں بھی متحرک رکھے ہوئے تھی۔

دشمن فوجیوں کے تو شاید وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستانی فوجی اپنی چیک پوسٹ چھوڑ کر آگے نکل کر اس رابطہ پل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

تبھی آخری معرکے کے طور پر دشمن فوجیوں

کی ایک ٹولی نے اپنی چوکی چھوڑ کر اس رابطہ پل پر آنے کا سوچا- نہ جانے کتنے دنوں سے وہ اس حملے کی بھرپور منصوبہ بندی کر رہے تھے-

دشمن کے فوجی اب پل کے کافی قریب آ چکے تھے خوش قسمتی سے ابھی تک ان کی نظر غازی پر نہیں پڑی تھی- بس ایک آخری بم رہ گیا تھا جس میں تین منٹ کے بعد کا وقت سیٹ تھا- اور غازی احمد کو ہر حال میں کچھ آگے بڑھ کر پل کے بیچ و بیچ اس بم کو نصب کرنا تھا ورنہ ساری محنت رائیگاں جاتی-

مسلسل سرکنے سے غازی احمد کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح شل ہو چکے تھے- بازو کے زخم سے رستا ہوا گرم گرم خون بھی سخت سردی میں کب کا منجمد ہو چکا تھا-

اور پھر جب کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے غازی احمد نے آگے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو اچانک ایک دشمن فوجی کی نظر اندھیرے میں سرکتے ہوئے غازی احمد پر پڑی اور اس نے چیخ کر ساتھی فوجیوں کو مطلع کیا- اگلے ہی لمحے ان میں سے کچھ فوجی پل پر اور کچھ فوجی اسی پل کے اطراف میں اپنی پوزیشن سنبھال چکے تھے- وائرلیس کی آوازیں نزدیک سے ہی آ رہی تھیں وہ مزید فوجیوں کو پل کی طرف آنے کے احکامات دے رہے تھے... ہلچل مچ چکی تھی... چیخ و پکار اور مسلسل بڑھتی فائرنگ میں مزید تیزی آ گئی تھی..... شاید وہ بھی نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ اطراف میں کتنے پاکستانی فوجی کور پر موجود تھے- گھبراہٹ میں وہ لوگ مسلسل فائرنگ کر رہے تھے- گولیاں غازی احمد کے اطراف سے گزر رہی تھیں.. ایک گولی زناٹے بھرتے ہوئے غازی احمد کے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور ساتھ ہی جیسے ہر طرف سناٹا سا چھا گیا بس چمکتی ہوئی روشنیاں جو فوجیوں کی بندوقوں سے نکل رہی تھیں غازی احمد کو نظر آ رہی تھیں- اب اس کے پاس بس دو منٹ بچے تھے- پیچھے نصب بموں کے پھٹنے میں اور اس سے پہلے یہ بم اپنی جگہ پر لگانا تھا.....

گولیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غازی احمد سرکتا رہا... اور پھر ایک دو تین..... نہ جانے کتنی گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں..... وہ دشمن فوجیوں کی نظروں میں آ چکا تھا... پل کے بیچوں بیچ خود کو چھپانے کی اب کوئی جگہ بچی بھی نہ تھی- آخری منٹ... آخری بم

غازی احمد کا پورا جسم سن ہو چکا تھا... خون مسلسل بہہ رہا تھا... کڑکتی سردی میں بہتا ہوا گرم خون اب غازی کے جسم کو تقویت پہنچا رہا تھا-

دشمن کے فوجیوں کے جوتوں کی دھمک غازی احمد کو پل پر محسوس ہو رہی تھی.....

اس کو اپنا دماغ غنودگی میں جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا...

وہ بم نصب کر چکا تھا.....

آخری کچھ سیکنڈز.....

پتر ناجاگا کراتنی رات گئے تک..

دیکھ تو سر میں کتنی خشکی ہوگئی ہے.....

تو ماں جی آپ تیل لگا دیا کریں نا.....

چل بیٹھ ادھر میرے پاس... بند کر اب سب کتابیں... بہت پڑھ لیا آج.....

چل میں تیرے سر میں مالش کروں.....

ماں کی انگلیاں اسے اپنا سر سہلاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں..

ماں کی گود میں سر رکھے کتنا سکون مل رہا تھا.....

اب اسے غنودگی آنا شروع ہوگئی تھی...

دشمن فوجی غازی احمد کو مردہ سمجھ کر اس کے کافی نزدیک آچکے تھے.....

آخر کے پانچ سیکنڈز.....

بابا کی وردی کی خوشبو غازی احمد کو اپنے اطراف میں ہی کہیں محسوس ہو رہی تھی۔

تین سیکنڈز.....

فوجی غازی احمد کے سر پر پہنچ چکے تھے.....

غازی احمد کے لبوں پر پرسکون مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے غازی احمد نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے اس کو جس مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا تھا وہ مقصد اس لمحے پورا ہوا.....

اور اگلے ہی لمحے ہونے والے مسلسل دھماکوں نے دشمن فوجیوں کے ناپاک وجود کو چیتھڑوں میں تبدیل کر دیا...

دشمن کی چیک پوسٹ پر موجود باقی فوجی گھبراہٹ میں اپنا اسلحہ بارود اور لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

اس بار یہ ان کی عبرت ناک شکست تھی۔

کیپٹن عبدالقوی اور باقی دونوں جوانوں نے پل کو تباہ ہوتے دیکھ کر نعرہ تکبیر... اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرنا شروع کر دیں۔

غازی احمد اپنے مشن میں سرخرو ہوتے ہوئے شہادت کے اعلیٰ ترین رتبے پر فائز ہو چکا تھا۔

پاکستانی چوکی اس بار بھی ناقابل تسخیر رہی تھی۔

دشمن کی پسپائی دیکھ کر کیپٹن عبدالقوی سوچ رہے تھے کہ جب تک غازی احمد جیسے سرفروش اور جانباز جوان پاکستانی فوج میں شامل ہیں دشمن اپنے ناپاک عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کچھ ہی دیر میں پاک فوج کا تازہ دم دستہ اس چوکی پر پہنچ چکا تھا.....

زخمی کیپٹن عبدالقوی اور دونوں ساتھی بیس کیمپ میں معرکے میں کامیاب ہو کر واپس لوٹ آئے تھے۔

بیس کیمپ واپس پہنچتے ہی وائرلیس پر اپنے کمانڈنگ آفیسر کو اس معرکے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کیپٹن عبدالقوی نے فخر سے کہا..

سر!!!!

غازی شہید ہوگیا!!!

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

جب یونین کا صدر مجھے ملنے آیا تو ساتھ ہی مطالبات کی فہرست بھی لایا۔ تیس مطالبات جو گزشتہ کئی برسوں سے حل طلب تھے۔ میں نے ان پر غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ چند ماہ تک میں عملے کی کارکردگی کا جائزہ لوں گا۔ یہ درست ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ملنی چاہئے لیکن اس کے لئے پسینے کا نکلنا بھی ضروری ہے۔ میں نے ایک کمیٹی بنا دی جس نے سب مطالبات اور ان کے منظور ہونے کی صورت میں مالی مضمرات کا جائزہ لیا۔ پھر

یونین کے نمائندوں کو بٹھا کر ہر مطالبہ کا جائزہ لیا۔ جو مطالبات منظور ہو سکتے تھے منظور کر لئے جو نہیں ہو سکتے تھے وہ بھی بتا دیئے۔ اس طرح بیس سالہ پرانا مسئلہ بطریق احسن حل ہو گیا۔ اس سے عملے میں Initiative پیدا ہوا اور انہوں نے تندہی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

شہر کا سب سے بڑا مسئلہ صفائی اور حفظانِ صحت تھا۔ ہم نے پہلی مرتبہ Solid waste Management پر باہر سے ماہرین بلوائے اور تجرباتی طور پر ہر گھر میں پولیتھین بیگ تقسیم کرنے شروع کیے۔ شہر میں Overhead padestrian bridge بنوائے۔

سب سے بڑا آپریشن بھینسوں کو شہر بدر کرنا تھا۔ آدھی گندگی ان کی وجہ سے پھیلتی تھی۔ جہاں جہاں سے ان کے ریوڑ گزرتے، ٹریفک بلاک ہو جاتی۔ اس کے لئے دو کالونیاں ہربنس پورہ اور رکھ چندراں بنوائی گئیں۔ گوالے بوجوہ شہر میں رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے رٹ کر دی۔ ہم نے ایس ایم ظفر کو وکیل کیا اور خاصی جدوجہد کے بعد قانونی جنگ جیت لی۔ سینکڑوں اہلکاروں اور پولیس کی مدد سے بھینسوں کو کالونیوں میں منتقل کیا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا لیکن کامیابی سے مکمل کیا۔

عید قربان پر جانوروں کی آلائشوں سے بڑا تعفن پھیلتا۔ لوگ غلاظتیں سڑک پر پھینک دیتے۔ اس کے لئے خصوصی ٹیمیں بنوائیں اور یہ طے پایا کہ تین دن تک کارپوریشن کا عملہ شفٹوں میں دن رات کام کرے گا اور صبح کو ایک آلائش بھی سڑک پر نظر نہیں آنی چاہئے۔

ایک اور بڑا مسئلہ برسات کے موسم میں پیدا ہوتا۔ بارش کا پانی نشیبی علاقوں کی گلیوں اور سڑکوں پر جمع ہو جاتا اور آبادیاں جھیلوں کا منظر پیش کرتیں۔ پانی اُترنے کے بعد وبائی امراض پھوٹ پڑتیں۔ ہم نے تین سو Dewatering sets خریدے جو خراب تھے ان کی مرمت کرائی۔ ایک رات زبردست بارش ہوئی۔ شہر جل تھل ہو گیا۔ جنرل جیلانی نے امتیاز مسرور کو جگا کر کہا Imtiaz wake up, city is drowning (امتیاز! جاگو شہر غرق آب ہو رہا ہے) امتیاز مسرور نے مجھے فون کر کے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں دفتر میں بیٹھا تھا اور کارپوریشن کا عملہ نکاسی آب کر رہا تھا۔

جنرل جیلانی کارپوریشن کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ وہ بڑے باریک بین تھے۔ معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات تو بہت ہی نیچے چلے جاتے۔ جب بھی کسی سربراہ مملکت کا دورہ

ہوتا تو لاہور شہر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا۔ اُن کا حکم تھا کہ شاہی قلعے سے لے کر شاہدرہ تک تمام عمارتوں کو رنگ روغن کیا جائے۔ دیواروں پر کاغذ کا ایک ٹکڑا تک نظر نہیں آنا چاہئے۔ بوریوں سے نشانات مٹاتے مٹاتے عملے کے ہاتھ گھس گئے۔ درختوں کے تنوں کو سفید رنگ لگایا جاتا۔ فت رنگ بینر اس طرح لگائے جاتے کہ اگر سبز رنگ پہلے نمبر پر ہے تو پھر دوسرا اس رنگ کا بینر آٹھویں نمبر پر ہونا چاہئے۔ اگر ساتویں پر لگا ہوتا تو سارے عملے کی شامت آ جاتی۔ کہتے Summitery ختم ہو گئی ہے۔ ان کی رسیوں کی Alignment پر اعتراض کرتے۔ یہ بات بھی مدنظر رہتی کہ سب کی بلندی ایک جیسی ہو۔ شالیمار کی پارٹی میں پڑھی جانے والی آیت کا خود انتخاب کرتے۔ موسیقی کی دھنیں خود ترتیب تو نہ دیتے لیکن بار بار سنتے۔ کبھی یہ کہہ کر نامنظور کر دیتے کہ یہ Moorse ہے۔ کبھی کوئی اور مین میخ نکال دیتے۔ دس مرتبہ تقریر لکھی جاتی۔ ذرا سے اعتراض پر ساری تقریر بدلنے کو کہتے۔ سیٹوں کی ترتیب کا ڈایا گرام خود دیکھتے۔ کس نے کہاں بیٹھنا ہے اشیائے خورد و نوش پر کڑی نظر رکھتے۔ پیسٹری یا پٹی کا سایز ذرا سا بھی بڑا ہوتا تو بیکر دھر لیا جاتا۔ وہ One small bite پر یقین رکھتے۔ جس طرح مخلوط محفلوں میں کیلے کو کاٹ کر رکھا جاتا ہے اسی طرح بڑی پیسٹری یا کیک پیس کو ریک سمجھتے۔ دن میں کئی میٹنگیں ہوتیں۔ چار مرتبہ ریہرسل کرائی جاتی۔

رہی سہی کسر ان کا نفس ناطقہ نکال دیتا۔ چیف سیکرٹری تمام متعلقہ محکموں کی میٹنگ بلاتا اور ہر شخص کو اس کے فرائض سے آگاہ کرتا۔ ایک مرتبہ معزول صدر رچرڈ نکسن نے آنا تھا۔ اس کے پروگرام میں باغ جناح میں قائم پبلک لائبریری کو بھی دیکھنا تھا۔ ڈائریکٹر لائبریری کموڈور انعام الحق کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "مولانا پچھلی مرتبہ جب شاہ ارون آیا تھا تو آپ نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ اس مرتبہ غیر حاضری پر نوٹس لیا جائے گا۔"

کموڈور بولے "نماز تو میں اس مرتبہ بھی پڑھوں گا۔" اس پر صدیق غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ قریباً چیختے ہوئے بولا

Who has stopped you from saying prayers. You offer prayers ten times a day. Twenty times per hour.

اس پر ڈی جی نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا "سر! آپ ناراض ہو گئے ہیں۔ میرا مطلب آپ کو ناراض کرنا نہیں تھا لیکن

نماز تو میں پھر بھی پڑھوں گا۔"
چیف سیکرٹری کا نارمل چیخ گیا۔ اب کے اُونچی آواز میں جو منہ میں آیا کہہ ڈالا:

Secratary Education,

Take care of him

اس کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ ایئر فورس بلڈنگ کی پیشانی پر صدر نکسن کی تصویر اور پچاس فٹ کا جھنڈا چند گھنٹوں میں بننا چاہئے۔ کوئی جھول نہیں ہونا چاہئے۔ رنگ اصلی ہوں۔ یوں پتہ چلے کہ زندہ نکسن دیوار پر کھڑا ہے وغیرہ۔ میں نے کہا کارپوریشن کے پاس ایک پینٹر ہے جس کے پاس ڈھنگ کی سیڑھی تک نہیں ہے۔
کہنے لگے "اگر یہ نہ ہو سکا تو میں اسے فرائض منصبی کی کوتاہی سمجھوں گا۔"
باہر نکل کر میں نے میاں معراج دین کراؤن سینما اور چوہدری عید محمد رتن سینما کے مالکان کو فون کر کے اپنا مسئلہ بتایا۔ انہوں نے دس پندرہ پینٹر، کینوس اور مطلوبہ رنگ بھیج دیے۔ جنہوں نے نہایت سرعت اور فنکاری سے تصویر اور جھنڈا مکمل کر دیے۔ میرا خیال تھا کہ تصویر دیکھ کر خوش ہوگا۔ اس نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کیا۔ فنکشن کے بعد سعید مہدی ملا۔ کہنے لگا "چیف سیکرٹری تم سے سخت ناخوش ہے۔ کہہ رہا تھا:

That corporation boy was giving me a cold feet

میرا معمول یہ تھا کہ صبح آٹھ بجے دفتر آتا اور رات کو نو بجے تک کام کرتا۔ اتنی محنت اور جانفشانی سے پہلے کام نہیں کیا تھا۔ اس دوران کئی میٹنگیں ہوتیں۔ امتیاز مسرور کو جنرل جیلانی نے کارپوریشن کا انچارج بنایا ہوا تھا۔ وہ ہر صبح بلا کر گورنر کی ہدایات اور آبزرویشن بتا دیتے۔ گورنر رات کو بارہ بجے کے بعد شہر کا چکر لگاتا اور جہاں جہاں کوئی خرابی ہوتی وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا۔ کس جگہ کوئی سڑک ٹوٹی ہوئی ہے۔ کہاں گندگی کے ڈھیر ہیں۔ فلاں فوارہ نہیں چل رہا۔ کھمبے پر ٹیوب لائٹ فیوز ہیں۔ پارک کی صحیح طرح سے دیکھ بھال نہیں ہو رہی۔ گھاس سوکھ گئی ہے، پھول مرجھا گئے ہیں۔ سرکاری زمین پر تجاوزات کھڑی ہو گئی ہیں۔ میئر سے کون کون سے کام کروانے ہیں۔ خود کیا کرنا ہے وغیرہ۔
ایک دن قیوم کا فون آیا۔ میئر صاحب نے اپنی شاز ولیبارٹری میں بلایا ہے کوئی ضروری میٹنگ ہے۔ میرے لئے یہ نئی بات تھی کیونکہ سب میٹنگز کمیٹی روم میں ہوتی تھیں۔ بہرحال میں چلا گیا۔ جب ملاقات ہوئی تو شجاع الرحمٰن نے ایک لمبی لسٹ نکالی۔ تین سو کے لگ بھگ آدمی بھرتی کرنے تھے۔

سکول ٹیچر، مالی، ڈرائیور، کلرکس، مکینک وغیرہ۔ کہنے لگے ''آپ کا کوٹہ چالیس آدمیوں کا ہے۔ اپنی مرضی کے بندے بھرتی کروالیں باقی میں کروں گا۔''

میں نے کہا'' پہلے تو میری کسی شخص سے کوئی واقفیت نہیں ہے چالیس آدمی کہاں سے لاؤں گا پھر بغیر انٹرویو کے ہم بھرتی کیسے کر سکتے ہیں؟''

بولے'' پہلے تو ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔''

عرض کیا'' اب نہیں ہوگا۔ اگر آپ نے کسی پر مہربانی بھی کرنی ہے تو اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔ خلاف ضابطہ کام کرنے سے کل کلاں مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ آپ نے کون سا ساری عمر لاہور کا میئر رہنا ہے یا مجھے اس سیٹ پر کام کرنا ہے۔''

انہوں نے میری باتوں کو محسوس ضرور کیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔

ون ہارس ریس: آخر وہ گھڑی بھی آ گئی جس کا چیف سیکرٹری کو بڑی دیر سے انتظار تھا۔ مارشل لاء کے خاتمے پر وزیر اعلیٰ کا انتخاب ہونا تھا۔ جنرل جیلانی جانے سے پہلے میاں نواز شریف کو نامزد کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت فیلڈ میں وزارتِ عالیہ کے تین اُمیدوار تھے۔ میاں نواز شریف، ملک اللہ یار کھنڈا اور سردار رفیق، حیدر لغاری۔ گورنر جیلانی یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ ون ہارس ریس ہے اس لئے ان کو ہلکا سا تھاپڑا اور تھوڑی سی ہلا شیری دے کر فیلڈ میں لے آیا تھا۔ ملک اللہ یار کھنڈے کا رہنے والا تھا اور ضلع اٹک کے بڑے زمینداروں میں سے ایک تھا۔ طبعاً شریف اور انتہائی کنجوس انسان تھا۔ ویسے بھی بارانی زمینیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، زیادہ پیداوار نہیں دیتیں۔ رفیق حیدر لغاری نام کی حد تک سردار تھا۔ رحیم یار خان کے قصبہ رحیم آباد سے تعلق تھا۔ متمول زمیندار تھا اور زیادہ سے زیادہ چار فرلانگ کا گھوڑا تھا۔ وزارت علیہ کی بارہ فرلانگ کی ریس کے لئے نہ تو اس کے پاس ہمت تھی نہ وسائل۔ ان کے برعکس نواز شریف کروڑوں میں کھیل رہا تھا۔ اتفاق فونڈری کا مالک اور جنرل کا چہیتا۔ جیلانی نے بڑی چالاکی سے سب ایم پی ایز کو بلا کر ضلع وار ان کی رائے لی۔ ممبران اسمبلی بھی بڑے کائیاں تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ہمانے کس کے سر پر بیٹھنا ہے اس لئے وہ ہونے والے وزیر اعلیٰ اور جنرل جیلانی کی ناراضی کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارے ضلع کے ایم پی اے جب اندر گئے تو گورنر نے پوچھا کہ ان کے خیال میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ کس قسم کا ہونا چاہئے؟ اس پر سب یک زباں ہو کر بولے'' نوجوان ہو۔ پڑھا لکھا ہو، خوبصورت ہو اور..... اور

بلی آنکھوں والا ہو۔'' جنرل جیلانی نے فقرہ مکمل کردیا۔

نواز شریف وزیر اعلیٰ بنا تو اہل لاہور نے اس کے اعزاز میں باغ جناح میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اہل لاہور کا تو محض نام تھا۔ سب اہتمام چیف سیکرٹری نے کیا تھا۔ وہ نئے باس کو اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ چونکہ باغ محکمہ زراعت کی ملکیت تھا اس لئے اس کی تزئین و آرائش بھی ان کے ذمے تھی۔ امتیاز مسرور نے مجھے بلا کر کہا ''اگر وہ کسی چیز کا مطالبہ کریں تو ان کی مدد کی جائے۔'' فنکشن سے قبل چیف سیکرٹری آیا تو آتے ہی پھنکارنے لگا۔ بولا ''بینرز صحیح طرح سے نہیں لگے۔ ہے کوئی جو انہیں فنکشن سے پہلے بدل دے۔'' سب چپ رہے۔ اس نے پھر سعید مہدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہے کوئی جو انہیں چیف منسٹر کے آنے سے پہلے بدل دے۔'' پھر سب چپ رہے۔

میں نے کہا ''میں آدھے گھنٹے میں بدل دیتا ہوں'' اس پر وہ غصے سے دھاڑا۔

Half an hour means your transfer within half an hour.

I don't mind میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

میاں نواز شریف کو ملک سلیم اقبال نے بتایا تو اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ چیف سیکرٹری چاہتے ہوئے بھی مجھے ایڈیشنل ڈی نہ بنا سکا اور میرا تبادلہ بطور ڈپٹی سیکرٹری ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں کردیا۔

گو میں وہاں زیادہ دیر نہ رہا لیکن چند واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ جونیجو حکومت نے نئے بجٹ میں اعلان کیا کہ بیواؤں کو تاحیات پنشن ملے گی۔ چیف سیکرٹری کا حکم آیا کہ ایک سابقہ سپرنٹنڈنگ انجینئر پبلک ہیلتھ کی فائل نکالی جائے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے فائلوں کے انبار سے نکالا۔ کچھ روز بعد اس کا پرائیویٹ سیکرٹری جمیل ایک سرٹیفکیٹ لایا جس میں چیف سیکرٹری نے تصدیق کی تھی کہ اس کی بیوہ نے دوسری شادی نہیں کی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اس نے دوسری شادی خود حضرت کے ساتھ کر رکھی ہے۔ دراصل ہوا یوں کہ ضیاالحق کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ حضرت نے Gulberg III میں ایک داشتہ رکھی ہوئی ہے اور ہر روز شام کو کوئے ملامت میں جاتے ہیں۔ اس نے اس بات کا ذکر گورنر جیلانی سے کیا۔ گورنر نے خود تو بات نہ کی لیکن ڈاکٹر فتح خان اختر سے کہلوا بھیجا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ڈاکٹر فتح خان اختر چوہدری

صدیق کا دوست تھا اور چونکہ اس وقت تک دیا گرا قسم کی ادویات دریافت نہ ہوئی تھیں اس لئے وہ وقتاً فوقتاً انجکشن کے ذریعے ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ یہ سنتا تھا کہ چیف سیکرٹری گھبرا گیا اور بڑی سوچ بچار کے بعد مولوی مشتاق کی طرح پچھلی تاریخوں میں ایک جعلی نکاح نامہ بنوایا۔ مولوی مشتاق نے جولی کے ساتھ شادی کا ڈھونگ رچایا تھا جو جنرل شیر جان کی بیٹی تھی۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایرانی بیوی سے جلیل شیر جان تھا۔ یہ وہی حضرت ہیں جو وگ لگائے بغیر چھت کی کار میں بیٹھے سر شام لبرٹی مارکیٹ میں کچھ تلاش کرتے نظر آتے تھے۔ اس نے ضیاء الحق کو ایک کھلا خط لکھا جو ہفت روزہ تکبیر نے من وعن چھاپا۔ اس نے لکھا کہ یہ جج اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے جسے کسی زمانے میں بیٹی کہہ کر پکارتا تھا۔ جب نوبت جوڈیشل کونسل تک رجوع کرنے کی آئی تو مولوی صاحب نے سابقہ تاریخوں میں اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ چیف سیکرٹری کا نکاح نامہ جنرل ضیاء الحق کو دکھایا گیا اور دلیل یہ دی گئی کہ کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ اس کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بات مجھے جنرل ضیاء الحق کے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی اور اسلم خان نے بتائی تھی اور اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسی چیف سیکرٹری نے محترمہ کی تصدیق کی تھی کہ اس نے دوسری شادی نہیں کی اور ہنوز بیوگی کے ایام گزار رہی ہے۔ اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا یا کہ نکاح نامہ جعلی تھا یا پھر سی ایس نے اس کو پنشن دلانے کے لئے تصدیق غلط کی تھی۔ ویسے یہ کوئی حیرت والی بات نہ تھی۔ حضرت کا نامہ اعمال اس قدر سیاہ تھا کہ اس کے چرچے سارے پنجاب میں تھے۔ چنیوٹ کے واقعہ نے تو انسانی ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے شخص کو چیف سیکرٹری لگانے سے جیلانی کی سوچ کا پتہ چلتا تھا۔

جمیل کہنے لگا کہ "میں بطور D.S.Administration تصدیق کر دوں۔"

میں نے کہا کہ "میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں اس عورت کو نہیں جانتا۔"

بولا "سی ایس تو جانتا ہے۔ جبھی تو اس نے تصدیق کی ہے۔"

"تو پھر میری تصدیق کی کیا ضرورت ہے۔"

آدمی بڑا ہوشیار تھا کہنے لگے "It is a legal Requirement سوچو۔ اگر چیف سیکرٹری ناراض ہو گیا تو تمہارا کیا بنے گا۔"

"پہلے وہ کون سا خوش ہے۔ اسے جا کر بتاؤ

کہ میں تصدیق نہیں کروں گا۔"
یہ کہہ کر میں نے فائل اسے لوٹا دی۔ وہ فوں فوں کرتا چلا گیا۔ سنا ہے میرے جانے کے بعد انہوں نے میرے جانشین سے تصدیق کرائی تھی۔

ایک اور بڑا عجیب اتفاق ہوا۔ ڈی ایس پی معین جس نے چوہڑ کے بدمعاشوں کے خلاف ہمارا پرچہ درج کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کے خلاف انکوائری سیکرٹری نے مجھے بھیج دی کہ میں Hearing کر کے اسے رپورٹ دوں۔ اس وقت وہ ایس پی بن چکا تھا۔ الزام یہ تھا کہ پنڈی میں جس سرکاری مکان میں رہتا تھا اس کو غیر مسلم جائیداد ظاہر کر کے اس نے خرید لیا تھا۔ وہ بڑا سٹپٹایا لیکن جرم ثابت تھا۔ اس کے خلاف رپورٹ گئی تو اسے Demote کر کے ڈی ایس پی بنا دیا گیا۔ ایک ایکسیئن اللہ بخش کو محکمے نے ڈسمس کر دیا تھا۔ اس کی اپیل میرے پاس آئی۔ یہ کرنل جہانیاں کا بھائی تھا۔ جب فیروز والا فراڈ کیس چل رہا تھا تو اس نے بغیر واقفیت کے میری مدد کی تھی۔ اس وقت وہ ملٹری انٹیلی جنس میں میجر تھا۔ بعد میں اسے فالج ہو گیا اور عملاً بستر پر لگ گیا۔ اس کے بچوں کی کفالت اللہ بخش کرتا تھا۔ وہ آیا تو رو رو کر اس کا برا حال ہو گیا۔ انکوائری کے بعد پتہ چلا کہ زیادتی ہوئی ہے۔ مجھے سیکرٹری نے بلا کر کہا کہ اس کو بحال نہیں کرنا۔ اس کے خلاف رپورٹ کر دو۔ میں نے کہا کہ یہ بے گناہ ہے۔ محکمے کی ملی بھگت سے اسے نکالا گیا ہے۔ آپ اس گناہ میں شریک نہ ہوں۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اللہ بخش بحال ہو گیا۔

جب میں نے چارج لیا تو اس وقت سیکرٹری حسن رضا پاشا تھے۔ وہ بڑے محنتی اور ایماندار افسر تھے۔ مزاجاً نہ صرف سخت گیر تھے بلکہ اکثر بدتمیزی پر بھی اُتر آتے۔ یہ مشرقی پاکستان میں جنگی قیدی رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اس اسیری کا اثر ہوا۔ مزاج میں غصہ اس قدر تھا کہ جب کمشنر سرگودھا تھے تو کسی بات پر بیگم سے ناراض ہو گئے۔ اپنا بوریا بستر اُٹھا کر سرکٹ ہاؤس میں چلے آئے اور ایک طویل عرصہ تک وہاں قیام کیا۔ جب لوگ استفسار کرتے تو ان کا ذاتی عملہ مسکرا کر کہتا۔ صاحب آج کل بیگم سے روٹھا ہوا ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی فائل بھی پہلی ریڈنگ میں نہ نکالتے۔ ہر مثل پر Speak لکھ دیتے۔ اس طرح فائلوں کا انبار لگ جاتا۔ جب Discussion کے لئے ڈپٹی سیکرٹری جاتا تو فائل اُٹھا کر کہتے ہاں تو پھر Facts کیا ہیں؟

پتہ نہیں پہلے ڈپٹی سیکرٹری کس طرح گزارا کرتے تھے لیکن مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایک

دن میں فائلوں کا انبار اُٹھائے ان کے کمرے میں گیا تو پتہ چلا کہ آرام فرما رہے ہیں - ان کو عارضہ قلب ہو گیا تھا اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق لنچ کے بعد دفتر میں ہی قیلولہ فرماتے تھے- خیر میں ان کے پی اے کے پاس بیٹھ گیا- ایک گھنٹے کے بعد قاصد نے آ کر کہا ”صاحب نے یاد فرمایا ہے-“ میں اندر گیا تو انہوں نے کسی قسم کی معذرت نہ کی-

ایک مثل اُٹھا کر بولے ”تم نے یہ نوٹ کس بنا پر لکھا ہے؟“

”کون سا نوٹ؟“ میں نے پوچھا-

بولے ”وہی نوٹ جو اس فائل پر لکھا ہے-“

”کون سی فائل؟“

غصے سے بولے ”فائل پڑھ کر کیوں نہیں آتے؟“

میں نے کہا ”آپ مثل ڈسکس کر رہے ہیں یا بجھارتیں بھجوا رہے ہیں- I dont not have photogenic memory-“ سمجھ گئے کہ یہاں پانی مرتا ہے-

چپ کر گئے- ویسے اگر شکایت کر دیتے تو چیف سیکرٹری نے مجھے جزائر انڈیمان بھیج دینا تھا-

میرے چارج لینے کے دو ماہ کے اندر ان کا تبادلہ سنٹر میں ہو گیا- میں نے محکمے کی طرف سے الوداعی کھانے کا کہا تو مسکرا کر بولے ”Are you sure? آج تک کسی محکمے نے میرا کھانا نہیں کیا ہے-“

اُن کا کہنا درست تھا- سٹاف نے اپنے حصے کے پیسے دینے سے انکار کر دیا نتیجتاً مجھے اپنی جیب سے اہتمام کرنا پڑا-

سبطِ حسن کی جرأت انکار دیکھنا:

پاشا صاحب کی جگہ سبطِ حسن شاہ آئے- شاہ صاحب بدتمیز تو نہ تھے لیکن باتونی بہت تھے- جائز کام کرنے سے بھی حتی الوسع گریز فرماتے- صبح تشریف لاتے اور رات گئے تک فائلوں سے کھیلتے رہتے- ایک مرتبہ روحیل اصغر وزیراعلیٰ سے کسی اہلکار کے تبادلے کے احکام لے کر آئے - شاہ صاحب ٹال گئے- مجھے بلا کر کہا اس فائل کو طاقِ نسیاں میں ڈال دو- عرض کیا کہ یہ شخص وزیراعلیٰ کا خاص آدمی ہے- خاصا منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ ہے- میاں شجاع الرحمٰن بھی اس سے کنی کتراتا تھا- جب سے اس کے والد شیخ اصغر کا قتل ہوا ہے یہ دس بارہ بندوق بردار ساتھ رکھتا ہے- خود بھی جیل کاٹ چکا ہے- میں اس کا مزاج شناس ہوں- چھوٹا سا کام ہے بہتر ہے کر دیں پھر آپ کون سا ازخود کریں گے وزیراعلیٰ کا حکم ہے-

غصے سے بولے ”تم مجھے بزدل سمجھتے ہو- ایسے کتنے بدمعاش میری چوکھٹ پر ہر روز

سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ میں ٹیکسلے کا رہنے والا ہوں تم نے شاید وہاں کے سادات کی شہرت نہیں سنی۔ میں خاموش ہو گیا۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک دن روحیل اصغر چپڑاسی کو دھکا دیتے ہوئے اپنے گن مینوں کے ساتھ ان کے کمرے میں گھس گیا۔ غالباً کوئی ایسی گالی نہ تھی جو اس نے قبلہ شاہ صاحب کی نذر نہ کی۔ آخر میں یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ کل تک اگر کام نہ ہوا تو وہ انہیں ٹھوکریں مارتا مارتا دفتر سے نکال دے گا۔

دفتر میں کھلبلی مچ گئی۔ عملہ چٹخارے دار زبان میں ایک دوسرے کو آنکھوں دیکھا حال سنانے لگا۔ چند نے تو مبالغہ آرائی اور غلو سے بھی گریز نہ کیا۔ کافی دیر تک شاہ صاحب کا ذہن ماؤف رہا۔ مجھے فون کر کے بلایا اور کہنے لگے کہ میں اس کا تبادلہ کر دوں۔ ''آخر آپ اس بدمعاش کی بات مان ہی گئے ہیں'' میں نے چھیڑا۔

کہنے لگے ''اے گل نئیں۔ او مائنڈ امریدائے'' (وہ میرا مرید ہے)

چند ماہ بعد میرا تبادلہ بطور ڈپٹی کمشنر رحیم یار خان ہو گیا۔ اس میں میری کاوش کم اور حالات و واقعات کا زیادہ دخل تھا۔ کھاریاں کی طرح یہاں بھی ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ کسی 'خاص' افسر کا تقرر ضروری ہو گیا۔ رفیق حیدر لغاری تو باغی گروپ میں تھا ہی، مخدوم الطاف بھی پر تولنے لگا۔ حسن محمود کی وفات کے بعد ٹکٹ دینے کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ میاں نواز شریف نے میٹنگ کی تو قرعہ میرے نام نکلا۔

جب میں چیف سیکرٹری کے پاس کرٹسی کال کرنے گیا تو وہ پھنکار رہا تھا۔ ہر کسی کو کہہ رہا تھا This transfer has been made over my head and behind my back- بے بس تھا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چٹ بھیجی تو خاصی انتظار کے بعد اس نے مجھے اندر بلایا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا Sir! I have come to thank you for having reposed this confidence in me-

اس کے چہرے پر غصے کا مدوجزر اُبھرا۔ حلق سے سانس کی بجائے سیٹیاں سی بجتی ہوئی نکلیں - بڑی مشکل سے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا Wish you good luck & God speed- اور میٹنگ ختم ہو گئی۔

[جاری ہے-]

یہ کہاں نصیب میرے..... [قسط#2]

طواف نہائت خشوع وخضوع سے مکمل ہوا نماز عصر بھی کعبہ کے طواف کے دوران سب کے ساتھ ادا کی۔ ایک اور معجزہ اسی نماز کے دوران رونما ہوا۔ میں ایسی غیر از عقل باتوں پر خاص یقین نہیں رکھتی مگر چونکہ یہ ذات بیتی ہے تو برحق ہے۔ مجھے ایک دو برس سے بائیں ٹانگ کے اوپر کے حصے میں شدید کھنچاو محسوس ہوتا تھا۔ میں بھی بہانہ خور شائد موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کھڑے کھڑے یا بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی عادی ہونے لگی۔ سجدے کے لئے جھکتے وقت مجھے شدید کھنچاو محسوس ہوتا۔ کعبہ کی سرزمیں پر نماز ادا کرنے سے پہلے میں نے اپنے رب سے التجا کی کہ مالک میں سب کی طرح معمول کے مروجہ طریق سے نماز ادا کرنا چاہتی ہوں مجھے ہمت عطا کر، یہ کہہ کر میں نے اپنی مٹھیوں پر پھونک ماری اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹانگ کی اوپری جانب ران کے باہر والے حصے پر اچھی طرح پھیرے جیسے کوئی دوا لگاتے ہیں۔ خدا گواہ ہے وہ دن اور آج کا دن وہ کھنچاو نہ جانے کدھر گیا۔ میں گویا وہ درد وہیں کعبہ کی ہواوں میں چھوڑ آئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد میں نے یکبار سوچا کہ اگر کسی کا اس دم وضو قضا ہو جائے تو وضو گاہ تو گراونڈ فلور پر بہت دور ایک کونے میں ہے۔ اتنا وقت کسی کے پاس کہاں کہ کوئی وضو کی حاجت میں چل کر اتنی دور جائے۔ بحر حال طواف سے فارغ ہو کر ہم صفا مروہ کے طویل رہگزار کے اس ٹھنڈے فرش پر ننگے پاوں دائیں سے بائیں بائیں سے دائیں چکر لگانے لگے۔ مرے ننگے پیر پتھر ہو رہے تھے۔ مگر میں نوید کے مضبوط ہاتھ کے سہارے چکر لگاتی رہی۔ اب نشان صفا و مروہ وہ پاک مٹی ک کے پہاڑ نہیں ہیں بلکہ اب یہ نشانیاں فائبر گلاس یا کسی اور

رخشندہ نوید

مینل سے بنادی گئی ہیں جو کسی طور پہاڑیاں نہیں لگتی ہیں۔ ان مصنوعی تبدیلیوں نے دل مرادل خراب کیا۔ دوران طواف کعبہ دور دور سے حجرِ اسود کا بوسہ لیا۔ اور خود کو تسلی دی کہ ہمارے نصیب میں بس اتنا ہی تھا۔ وگرنہ وہ لوگ موجود تھے جو عین خانہ کعبہ قریب چلتے ہوئے طواف کر رہے تھے۔ انھوں نے حجر اسود کو یقیناً چوما بھی ہوگا۔

مغرب کی نماز کے بعد ہمیں پروٹول آفیسر کے فون آنے شروع ہو گئے۔ ابھی دل نہیں بھرا تھا اس فضا میں کچھ اور سانسیں لینے کو دل مچل رہا تھا اور کہیں آس پاس ہی چادر ڈال کر بیٹھ جانے کی خواہش تھی کسی خیمے میں رات گزار کر صبح صادق کے وقت دیوار کعبہ کے سائے نماز پڑھنے اور ایک اور طواف کی تمنا تھی۔ مگر پروٹول آفیسر کے تیسرے فون کے بعد اسی دروازے پر پہنچنے کے لیے ہم نے راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ ہم اس سے کہیں خیالات کی بھول بھلیوں میں محو تھے اس وقت نماز مغرب کے لیے ہر طرف صفیں بچھی ہوئی تھیں اور نمازی نماز کے لیے تیار تھے۔ ہم جس مقام پر اُس وقت موجود تھے۔ یکدم وہاں حفاظت پر مامور فورسز کے نہایت ظالم، بے رحم پولیس والے ہاتھ میں ڈرانے کے لیے ڈنڈے تھامے ہر طرف کھڑے دکھائی دیئے۔ اب ہم جس جانب سے باہر کی جانب جانے کی کوشش کریں ہمیں تقریباً دھکے دینے کے انداز میں واپس دھکیل دیا جائے۔ ایک دو جگہوں سے ہم نے پاکستانی پھرتی دکھانے کی کوشش کی کسی طرح آنکھ بچا کر ان رکاوٹوں کے نیچے سے نکل بھاگیں جو نماز کی ادائیگی تک کے لئے کھڑی کی گئی تھیں مگر وہ سیاہ وردی پوش عربی بہت ترش مزاج اور بہت چوکس تھے۔ انھوں نے کسی طرح ہماری بات نہیں سنی نہ ہی سمجھی کہ ہم کسی ایمرجنسی میں ہیں پروٹوکول آفیسر کی چار کالوں کے بعد اس وقت تک ہمارا فون بند ہو چکا تھا۔ ہم انتظار کرنے والوں کو بتانے سے قاصر تھے کہ ہم بلاک ہو گئے پھنس چکے ہیں۔ آخر چار و ناچار ہم خاموش ہو گئے اور اللہ کی رضا کے مطابق مغرب کی نماز وہیں سیڑھیوں پر پڑھی اور نماز کے ختم ہو جانے پر راستے کھلے تو ہم گیٹ کی طرف بھاگے بہرحال ہماری وقت کی پابندی کرنے کی کوشش کچھ اور ممبران سے کم تھی۔ ابھی ہمارے ساتھیوں میں کئی لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ مرد حضرات نے حجامت کی غرض سے کسی نے کم اور کسی نے تمام بال منڈوائے اور یوں ہم سب زیارت کعبہ کے بعد اسی رات واپس جدہ اپنے ہوٹل پہنچے۔ اپنا آپ جیسے کچھ ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا، جیسے ہمارے کردہ ناکردہ گناہ وہیں ہمارے

قدموں کی دھول کے ساتھ جھڑ گئے۔
رات خواب میں بھی ہم کعبہ کے غلاف کو دیکھتے رہے اگلی صبح یعنی جمعہ کی شام ۷ بجے ہمارا مشاعرہ تھا۔ یہ بادقا مشاعرہ پاکستان انٹرنیشنل سکول جدہ کی انگلش برانچ کے وسیع و عریض ہال میں تھا۔
رات ہی منتظمین نے اعلان کر دیا کہ کل یعنی جمعہ کے دن ہمارے مہمان شعرا میں سے ایک بھی فرد ہوٹل چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا کیونکہ مشاعرہ گاہ میں سب شاعر صحیح سلامت درکار تھے کسی ناگہانی آفت کے خوف سے شاعروں کے لیے اس روز آؤٹنگ بین تھی۔
نوید نے رات کمرے میں آتے ہی مجھے کہا کہ یار میں تو شاعر نہیں ہوں میں تو ایک اور عمرہ کر سکتا ہوں۔ میں نے خوف کا اظہار کیا کہ آپ کیسے وہاں پہنچیں گے ۔ نئی جگہ نیا ملک، نیا شہر۔
انھوں نے کچھ سوچ کر اپنی چھوٹی سی ڈائری نکالی اور اس میں درج ایک نمبر پر فون کیا۔ وہ ان کے اتحاد کیمیکلز میں جب وہ پروڈکشن منیجر تھے اس دور کا کوئی دوست یا جاننے والا تھا جو اس وقت جدہ میں مقیم تھا۔ نوید نے اس سے مشورہ کیا کہ میں کسی بھی طریقے سے مکہ پہنچنا چاہتا ہوں۔
اس اللہ کے بندے نے کہا سر میں ہوٹل سے آپ کو اٹھاؤں گا اور آپ کو ایک بس شاپ سے اچھی ایئر کنڈیشن سواری لے کر دوں گا جو آپ کو سیدھا مکہ پہنچا دے گی۔
واپسی پر بھی سر آپ جہاں اتریں وہیں سے یہی سواری جو شاید بڑی ۱۶ سیٹر ویگن تھی لے کر شاپ تک آئیں گے مجھے فون کریں گے میں وہیں سے آپ کو دوبارہ اپنی گاڑی میں بہ حفاظت بٹھا کر آپ کے ہوٹل پہنچا دوں گا۔
لیجیے صاحب! اگلی صبح یعنی جمعہ کے روز نوید صاحب اپنے دوسرے عمرہ کے لیے بصد شوق روانہ ہوئے۔ اور اپنے مصمم ارادے کے زور پر حجرِ اسود کو بوسے دینے سے لے کر، گراؤنڈ فلور پر خانہ کعبہ کے قریب ترین مقام سے طواف کرتے ہوئے ، اور مقام کعبہ کے سائے میں زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر قدم رکھنے میں بھی کامیاب ہوئے جسے جنت کا ٹکڑا کہا جاتا ہے اور یہاں قدم دھرنے والا گویا جنت میں اپنا نام لکھوا لیتا ہے۔ تقریباً عصر کے قریب نوید جمعہ کی نماز پڑھ کر صحیح سلامت ہوٹل پہنچ گئے۔
میں دل ہی دل میں دعا گو رہی کہ پہلی بار یہ مرے ساتھ کسی مشاعرے پر آئے ہیں۔ بخیر گھر لوٹیں اس دم وہ دراصل مری ذمہ داری تھے۔ مگر ان کے کولیگ خالد کی مدد کے باعث وہ یہ ایڈونچر کرنے کے قابل ہوئے شاید نوید نے خالد کے ساتھ کبھی کچھ اچھا کیا تھا جس نیکی کا خالد نے بدلہ اتارا۔

نوید نے بتایا کہ انہوں نے خالد کو دراصل اپنے پاس ٹریننگ انجینئر کے طور پر بھرتی کیا تھا اور اس کو کیمیکل انجینئرنگ کے میدان کے بہت سے گر سکھائے تھے ایک خالد ہی نہیں بلکہ نوید کی بھرتی کردہ ایک پوری کھیپ ہے جنھیں نوید نے اتحاد کیمیکلز میں خود رکھا تھا۔ یہ تمام انجینئرز بالآخر نوید کی فوج بن گئے تھے۔ ایک بار ان کو ہو جانے والی شیئر کا کی درد کے زمانے میں جب وہ ایک ماہ چھٹی کے دوران گھر بیڈ ریسٹ پر رہے، میں نے ان کی اس بریگیڈ کو جس طرح ان کی تیمار داری کرتے دیکھا، جان نچھاور کرنے کی حد تک ان سب نوجوانوں کی نوید کے لئے محبت ناقابل بیان رہی ہے۔

سو خالد نے اپنی پرانی محبت کا حق ادا کیا اور نوید صاحب دوسری بار عمرہ کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ جب وہ لوٹے تو ان کا رنگ سیاہ کالا، گرمی اور پبلک ٹرانسپورٹ کا سفر، طرہ یہ کہ کل رات عمرہ کے بعد حجامت سے ان کے سر پر برائے نام بال تھے۔ بس وہ عجیب سے لگ رہے تھے۔ مگر چلو دوسرا عمرہ تو ہو گیا۔ نوید کو پہلی بار میں نے کسی بھی شے کے لئے لالچ میں مبتلا دیکھا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ایک دو عمرے اور کیسے کر لیں۔

اسی شام یعنی جمعہ کے روز وہ مشاعرہ تھا ہم جس کے لیے جدہ بلائے گئے تھے۔ پاکستان انٹرنیشنل سکول کی انگریزی برانچ کا وسیع و عریض ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شہر جدہ کی تمام ایلیٹ اور پڑھی لکھی باذوق کلاس اس ہال میں حاضر تھی۔

اس مشاعرہ کی کمپیئرنگ مرے نہایت محترم اور پسندیدہ انسان خورشید رضوی صاحب کے بیٹے کر رہے تھے۔ کالی اچکن اور سفید کرتے شلوار میں وہ تیز تیز چلتے ہوئے مشاعرہ کی پلاننگ اور انتظامات کو دیکھ رہے تھے۔

اُن کی خورشید صاحب سے مشابہت تو بحر حال بہت ہے مگر جو بات قابل حیرت ہے وہ ان کی آواز کی مماثلت اور لہجے میں ہو بہو خورشید صاحب والا ٹھہراؤ۔ ان سے روز اول بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ اور دعوت کے بعد برقی خط و خطابت مری جدہ میں ہوتی رہی وہ عاصم رضوی تھے وہ بھی اس مشاعرے کے منتظمین میں شامل تھے۔ ان کی بیگم نہایت تعلیم یافتہ مگر سادگی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ مشاعرہ نہایت شاندار رہا۔ خوب داد وصول پائی۔ مشاعرہ کا حق ادا ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ تمام شہرۂ آفاق شاعر اپنی شاعری کے گل کھلا رہے تھے ان کی مہک آج بھی جدہ شہر میں موجود ہو گی۔ اس سکول کے اساتذہ بھی انتظامی امور کے ساتھ مشاعرہ گاہ کو حسین ترین روپ میں ڈھالنے اور ہمارے آگے پیچھے رہنے میں مستعد تھے۔ ہر مشاعرہ

پڑھتے ہوئے سٹیج پر بیٹھے بیٹھے میں خدا کی قدرت کی اتنی شاکر رہتی ہوں کہ مجھے بھی اُس نے ان لوگوں میں شامل کیا جو پیدائشی رائٹر اور شاعر پیدا ہوئے۔ یہ جو مرے چہرے پر ذرہ بھر بھی چمک ہے تو وہ شکرانوں کی ہے جو مرے لوں لوں سے ہر دم صنوبر یز رہتی ہے۔

نوید افضل بھی سامنے سامعین میں کونسل جنرل جاب آفتاب احمد کھوکھر ان کی بیگم کونصلیٹ کے ملازمین، شہر بھر کے معززین کے ساتھ مشاعرہ سننے میں مصروف تھے۔ میں بہت تھوڑا سا مختلف محسوس کر رہی تھی۔ مجھے یقیناً بہت پسند نہیں ہے کہ مری فیملی مرے مشاعروں اور اس قسم کی مصروفیات کا حصہ بنیں۔ میں تھوڑی سی نروس بھی تھی۔ بہر حال میں نے اپنی انھیں غزلوں سے آغاز کیا جو مقبول ہوئیں۔

کہانیاں نہ ختم ہونگی اختتامیوں کیساتھ
مجھے قبول کر مری تمام خامیوں کیساتھ
اس آنکھ میں آنسو ہے کہ پانی نہیں سمجھے
تم میری محبت کی کہانی نہیں سمجھے
بات جو بھی دل میں ہے اظہار میں تو آئے گی
درد کی گہری چبھن اشعار میں تو آئے گی

.....

اللہ تعالیٰ کے کرم کے باعث مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ کھوکھر صاحب، مختار علی و دیگر منتظمین بہت خوش اور مطمئن تھے کہ ان کی کاوشوں سے مشاعرہ نہایت عمدہ رہا۔ عاصم خورشید کی کمپیئرنگ بھی لاجواب تھی۔

مشاعرہ کے بعد تمام منتظمین ہمارے ساتھ ہوٹل واپس آئے وہاں تا دیگر گفتگو، تشکر، کھانے پینے اور آخری ملاقاتوں پر مختصر رہی۔ چونکہ یہ ہماری اس ہوٹل میں آخری شب تھی۔ اگلی صبح ہوٹل سے چیک آوٹ کے بعد تمام شعرا کونسل جنرل صاحب آفتاب احمد کھوکھر کے گھر لنچ کرنے کے بعد سیدھے مدینہ شریف کے لیے کوچ کر جانے والے تھے۔

اگلی صبح ہم سب کونسل جنرل صاحب آفتاب احمد کھوکھر صاحب کے دولت کدہ پر پُر تکلف لنچ کرنے کی غرض سے بلائے گئے۔ آفتاب کھوکھر اور ان کی بیگم بہت ڈاؤن ٹو ارتھ اور اعلیٰ مزاج کی شخصیات تھے۔ میں نے ایک پل کو بھی ان میں خود پسندی - یا بدمزاجی نہیں دیکھی۔ مختار علی آفتاب کھوکھر صاحب کے بہت قریبی معاونین میں محسوس ہوتے تھے۔ کیونکہ اکثر اوقات، مختار ان سے کسی اگلے قدم کے لیے مشورہ لے رہے تھے اور بسا اوقات کھوکھر صاحب ان سے مشاورت میں مصروف دکھائی دیے - مختار اب پاکستان کے مزاروں اور ولیوں کے شہر ملتان میں قیام پزیر ہیں۔ ان کی لاجواب خطاطی کے ہنر سے میں اکثر سوشل میڈیا کے ذریعے واقف رہتی ہوں۔

کھوکھر صاحب کے گھر لنچ سے سیدھے ہم لوگ دیدار مصطفیٰ کے لیے بسوں میں روانہ ہوئے۔ پھر وہی قیمتی لمحات، ہنسی مذاق، گپ شپ، سیٹوں پر تبادلے۔ کبھی کسی کے ساتھ کوئی جا بیٹھا، کبھی کسی سے باآواز بلند باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اشعار کے تبادلے۔ میں ایک بات سے ضرور خائف رہی کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے کہ نوید افضل کو کہنے کا موقع مل جائے کہ تمھارے اس قسم کے بیرون ملک مشاعروں میں ایسے ہوتا ہے۔ میں خود بھی قصداً ہمیشہ ہی کافی محتاط رہنے کی عادی ہوں۔ مگر شکر ہے اس مشاعرے میں سب میرے اپنے لوگ موجود تھے۔ جن سے دوستی اور احترام بیک وقت قائم تھا، ہمارے مدینہ شریف میں قیام کے لیئے پاکستان ہاؤس یعنی نہائت محفوظ اور آرام دہ جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

پاکستان ہاؤس پہنچنے کے تقریباً گھنٹہ کے بعد حسنین ظفر پاکستان ہاوس پہنچ گیا اس نے ہماری آمد کا سن کر شہر ریاض سے 8 گھنٹے سفر طے کیا تھا اور اپنی چھندی پھوپھو اور نوید انکل کو ملنے اور مسجدِ نبوی لے جانے کا شوق پورا کیا تھا۔

حسنین ظفر مرے بھائی ظفر کا بڑا بیٹا جو کئی برسوں سے ریاض میں اپنے بیوی بچے کے ہمراہ رہ رہا تھا۔ اور شاید ہر ماہ وہ مدینے میں نمازیں ادا کرنے پہنچ جاتا ہے۔ اللہ نے چھوٹی سی عمر میں اسے نہایت شاندار گاڑی سے نوازا جس پر وہ ہر ماہ 8 گھنٹے کا سفر طے کرتے ہوئے مدینہ کی زیارت کے لیے آج بھی کرتا رہتا ہے۔

ہم نے اپنے پروٹول آفیسر نصراللہ خان اور اپنے تمام دوستوں کو بتایا کہ باقی سب ساتھیوں کے لیے آج شام جو بھی پروگرام طے پایا ہے ہم اس کا حصہ نہ بن پائیں گے کیونکہ حسنین ہمیں اپنے ساتھ مسجد نبوی لے جانے کی غرض سے آچکا ہے۔

حسنین کی بیوی چھوٹی سی لڑکی نبیلہ اپنے تین سالہ بیٹے کے ہمراہ تھی ان دونوں نے بڑی بہادری سے گھروں اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ لیکن وہ خوش و خرم بچہ پال رہے تھے اور اب حالات بہتر تھے۔ گھر والوں کو اس طریقے کی شادی کو تسلیم کیے بنا بن نہ پائی تھی۔

حسنین کی گاڑی میں مسجد نبوی تک پہنچتے ہمیں مغرب ہو گئی تھی۔ مسجد نبوی کے حسین ترین برآمدوں، صحن اور چمکتے ہوئے روشن فرش، لائٹنگ کا میں کیا کرتی کہ مجھے تو روضہ رسول کی جھلک درکار تھی۔ میں نے حسنین سے کہا کہ بس اسی جانب چلو جہاں روضے کی جالی ہے۔

مردانہ اور زنانہ سائیڈ سے الگ الگ دیدار روضہ رسول کی خاطر حسنین، نوید او حسنین کا

بیٹا مردانہ کی جانب شاویز چلے گئے اور ادھر میں اور نبیلہ زنانہ سائیڈ پر آ گئے۔ میں کیا دیکھتی ہوں کہ پچھلی طرف، وسیع و عریض برآمدوں کے باہر دیدار روضہ رسولؐ کے لئے تڑپتی ہزاروں خواتین کا ہجوم ایک موام پر جمع ہے بلکہ روک رکھا گیا ہے ان کو کنٹرول کرنے کے لیے دراز قد مردانہ قسم کی شاید پولیس کی خواتین وارڈن سیاہ برقعوں میں اپنے ہاتھوں میں سوٹیاں تھامے عورتوں کو بیٹھ جانے کی تلقین کر رہی تھیں۔ کیونکہ ایک مطلوبہ تعداد ہی ایک وقت میں اندر سما سکتی ہے۔ پہلا جتھا حضورؐ کو سلام کرنے کے بعد باہر آئے گا تو اگلا ریلا اندر جا سکے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ان سخت مزاج وارڈن عورتوں نے جہاں میں اور نبیلہ بیٹھے تھے اس جانب کی لائنوں کو اندر جانے کا عندیہ سنایا۔ کانوں نے سنا کہ جاؤ روضہ رسولؐ کی جانب جاؤ۔ کس کو خبر تھی کہ نبیلہ اس کے ہمراہ ہے۔ اور کسے پتہ تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی کس سمت جانا ہے کون سا راستہ حضورؐ کے روضے کی جانب لے جائے گا۔

بس رخشندہ نوید نے یہ دیکھا کہ عورتوں کا ایک ہجوم اس طرف بڑھ رہا ہے جدھر ان آنکھوں کی دنیا کا کنارہ ہے۔ زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ موٹر سائیکل شدید رش میں کس طرح رستہ بناتے ہوئے، کٹ دیتے ہوئے، ٹریفک کو ان دیکھا کرتے ہوئے سڑک پر بھاگتا ہے۔

میں نے یہ منظر دیکھ رکھا تھا جب کوئی بچہ دونوں ہاتھوں کو ہوا کے دوش پر کھولے اپنی کسی مستی میں کسی بھی جانب تھوڑا تھوڑا ڈولتے، سر کو ایک جانب گرائے بھاگ رہا ہو۔

ماں کی سبز چادر مرے سرتا پا تھی۔ احرام کا سفید حصہ جس سے مکہ میں سر ڈھانپا تھا۔ وہ میں نے دوبارہ نہیں اوڑھا بلکہ مدینہ میں مری ماں کی چادر ہی مری اوڑھنی رہی۔ ہزاروں پنکھے تھے مگر وفور جذبات کی گرمی چادر کے اندر محسوس ہو رہی تھی۔ اور اب میں روضہ رسولؐ سے چند قدم پر تھی۔ دھکم پیل کا وہ عالم تھا کہ کمزور خواتین بیہوش ہو سکتی تھی۔ عورتوں کا جم غفیر بال برابر فاصلہ بھی نہ رکھ پا رہا تھا۔ ایک دوسرے سے سبقت لینے کا سانجھا مقصد روضے سے قریب ہونا ہی تھا۔ کوئی برا نہیں منا رہا تھا کہ کسی نے اُسے دھکا دیا۔ ایکبار ایک عورت کا بھاری بھاری سینہ میرے اتنا ساتھ لگ گیا کہ گلے ملنا تو کیا وہ سانس روکنے کے برابر تھا۔ ایکبار تو مرا دم گھٹ گیا۔ میں نے ملتجی نظر سے اسے دیکھا کہ رحم کر بی بی۔

اس نے ہلکا سا کندھا اچکایا اور مجھے پیچھے اور بھینچ گئی۔

[جاری ہے۔]

غزل

کس نے بسایا شہر ہمارا
ظلم کی اینٹیں ، جبر کا گارا

راہ گزارو ، لاکھ پکارو
پلٹ چکا ہے ، وقت کا دھارا

بات بنالو ، پنکھ لگا لو
اڑنے کو ہے رنگ تمہارا

تم کو دیکھیں ، خود کو سمیٹیں
سب کی ہستی پارا پارا

کچھ تو سمجھاؤ ، کچھ تو بتاؤ
کوئی تو جیتا ، کوئی تو ہارا

تیرہ شبی سے ہم نہ ڈریں گے
دمک اُٹھا ہے ایک ستارا

ارزانی سی ارزانی تھی
پیار کا بول تھا مول تمہارا

دودھ کی نہریں ، خون کی لہریں
فرش پہ ہم نے عرش اتارا

سانجھ سویرے ، بال بکھیرے
ڈھونڈ رہے ہیں ایک سہارا

زہر ندامت ، قہرِ ندامت
یہ بھی گوارا ، وہ بھی گوارا

اور پریشاں ، اور پشیماں
قرض لیا ، یا قرض اتارا

ہم تو کوتا پڑھ پڑھ روئے
اور کوی نے محل اسارا

کون تمہیں سمجھائے خالد
کون اُٹھائے بوجھ تمہارا

خالد احمد

غزل

اپنے جذبات، میں بولوں تو کہوں
کُھل کے اِس حال کو رو لوں تو کہوں

کس قدر ملتا ہے محنت کا صلہ
سارے اسباب میں ڈھو لوں تو کہوں

غم کے اظہار ہیں کیسے کیسے
چشمِ بیمار بھگو لوں تو کہوں

مجھ کو پھر شوقِ سفر ہے کتنا
آپ کے ساتھ جو ہو لوں تو کہوں

میں نے بارش سے غرض پوچھی ہے
وہ کہے شہر کو دھو لوں تو کہوں

شعر کہنے کو سکوں ہو مجھ کو
میں ذرا دیر کو سو لوں تو کہوں

صیدِ صیاد اڑا ہے کیسے
آسماں پر جو میں ڈولوں تو کہوں

ہجر کا روگ کڑا ہے کتنا
دل کے سب راز میں کھولوں تو کہوں

کتنے آزار سہے ہیں ثاقبؔ
پھر اسی خاک سے مولوں تو کہوں

آصف ثاقب

غزل

اِس کونے سے اُس کونے تک بکھرا رنگ سنہرا ہے
دیکھو تو اس دل کی گلی میں کون مسافر ٹھہرا ہے!

آفت ہو یا مشکل کوئی، دُور کہیں رُک جاتے ہیں
میرے گھر کے ہر رستے پر، ماں کی دعا کا پہرا ہے

دل کی وسعت اور گہرائی دونوں ہی لاثانی ہیں
لاکھ خلا ہو حدِ نظر تک ، لاکھ سمندر گہرا ہے

صحرا اور سمندر میں جو بن جاتا تھا سمت نما
وہی ستارا دشتِ الم میں دل کا ساتھی ٹھہرا ہے

سب کو امجد گھیر رکھا ہے ، اپنے اپنے مطلب نے
کس کی آنکھیں اندھی ہیں ؟ اور کون یہاں پر بہرا ہے؟

امجد اسلام امجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

غزل

نئے بیانئے ارشاد کر دیے گئے ہیں
کچھ اور ولولے برباد کر دیے گئے ہیں

ہمیشہ ایک ہی تدبیر آزمائی گئی
وفا کے قافلے افراد کر دیے گئے ہیں

فرو ہوئی ہے بغاوت تو شہ کی جانب سے
اطاعتوں کے ثمر لاد کر دیے گئے ہیں

نصاب میں تھے جو عشق وجنوں کے افسانے
وہ حرص و آز کی روداد کر دیے گئے ہیں

اٹھا رہے تھے جو شہرِ صعود کی بنیاد
وہ سب نشانِ افتاد کر دیے گئے ہیں

جو صاحبانِ سلوک و عطا تھے بستی میں
سپردِ موسمِ بیداد کر دیے گئے ہیں

عذاب اِس سے بڑا کیا زمیں پہ اترے گا
طیورِ قید، سگِ آزاد کر دیے گئے ہیں

ترے ستم کو دعا خسروِ فرومایہ
کہ کوہکن مرے فرہاد کر دیے گئے ہیں

ہمیں خوشی ہے کہ عالی لہو گلاب اپنے
برائے باغِ وفا کھاد کر دیے گئے ہیں

جلیل عالی

غزل

چشمِ نم تو ہے وہی لیکن ضیا کچھ اور ہے
زخمِ تازہ پر نمک کا ذائقہ کچھ اور ہے

لب نہیں حسرت گزیدہ آنکھ ہے محوِ دعا
اس کو آنکھوں ہی سے سنیے یہ دعا کچھ اور ہے

سامنے ہر پل نصابِ زیست ہے لیکن ہنوز
پڑھ رہا ہوں اور کچھ لکھا ہوا کچھ اور ہے

رشتے ناتے، آشنائی، قربتیں اپنی جگہ
آدمی سے آدمی کا رابطہ کچھ اور ہے

جس تناظر میں اسے میری گواہی چاہیے
عبد اور معبود کا وہ سلسلہ کچھ اور ہے

فتح بھی دیتی رہی ہے داد ہمت کی مگر
جو ہزیمت نے دیا وہ حوصلہ کچھ اور ہے

سامنے وہ ہے تو کیوں اب تک بدن پگھلا نہیں
یہ مرا پیکر نہیں پیشِ خدا کچھ اور ہے

حسرتوں کی بادصرصر رقص میں ہے دور تک
شہرِ جاں کی ان دنوں آب و ہوا کچھ اور ہے

دور رہ کر بھی میسر ہے مجھے قربت کا لمس
دو کناروں سے جڑا یہ فاصلہ کچھ اور ہے

پتھروں کی زد میں رہ کر بھی ہے اب تک خوش جمال
دل نہیں سینے میں یہ شیشہ نما کچھ اور ہے

رازؔ پہلے دل میں جھانکو پھر اسے ڈھونڈو کہیں
تم سے کس نے کہہ دیا اس کا پتا کچھ اور ہے

رفیع الدین راز

غزل

گھونگرو دیکھتا ہے، رقص کا ڈھب دیکھتا ہے
دیکھنے والا کہاں اس کا سبب دیکھتا ہے

خواب میں جشنِ طرب دیکھنے والا انساں
حرفِ ماتم نہ کوئی نالۂ شب دیکھتا ہے

جس طرف اہلِ بصیرت کی نظر اٹھتی ہے
جس کو آنکھیں بھی میسّر ہیں وہ کب دیکھتا ہے

تیسری آنکھ سلامت ہو تو سونے والا
جو بھی اطراف میں موجود ہو سب دیکھتا ہے

نیند میں خواب کا منظر تو سبھی دیکھتے ہیں
جاگنے والا مگر خواب عجب دیکھتا ہے

وقت بازار میں لے آتا ہے چپ چاپ مجھے
پھر مری جیب نہیں اپنی طلب دیکھتا ہے

ہم بھی لوگوں کی طرح چین سے جی سکتے ہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے، رب دیکھتا ہے

اُس پہ طاری ہے فسوں شاہ کی خوشنودی کا
جو حقیقت ہو مورّخ اسے کب دیکھتا ہے

ہم سے بے نام و نسب لوگ کہاں جائیں کنور
دینے والا بھی اگر حسب و نسب دیکھتا ہے

اعجاز کنور راجہ

غزل

جبینِ وقت پہ ابھرے اذیتوں کے نشاں
کہ رزقِ آتش و آہن ہیں فرحتوں کے نشاں

کہاں سے آ گیا تیشہ ہوا کے ہاتھوں میں
شجر شجر کے بدن پر ہیں ضربتوں کے نشاں

مہکتی شام نے اوڑھا اداسیوں کا لباس
کہ چھا گئے ہیں ہر اک سمت ظلمتوں کے نشاں

حصارِ ذات سے باہر بھی آ کہ بات بنے
کہیں کھنڈر نہ بنیں اپنی عظمتوں کے نشاں

عجب نہیں کہ ہواؤں کے رُخ پہ چل نکلیں
کہ ہم میں اب نہیں اگلی سی سیرتوں کے نشاں

کھلی فضاؤں میں گھٹنے لگا ہے دم اپنا
کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں فراغتوں کے نشاں

سکوں ملا نہ پرندوں کو آشیانوں میں!
کہ آندھیوں نے مٹائے ہیں راحتوں کے نشاں

دعا کے ساتھ دوا بھی تو چارہ گر بھیجے
وہ بے خبر کہ جو دیکھے نہ حسرتوں کے نشاں

ہمارے عہد میں آئے وہ زلزلے کہ حسن
رہے نہ سینۂ گیتی پہ پربتوں کے نشاں

حسن عسکری کاظمی

غزل

کسی عشق میں مبتلا آدمی ہوں
تو مطلب یہ ہے، لادوا آدمی ہوں

زمیں نے کوئی قدر میری نہیں کی
کہ میں آسماں سے گرا آدمی ہوں

گنہ گار لوگوں نے دی ہے گواہی
کہ میں تو بڑا پارسا آدمی ہوں

یہ افواہ اُس بے وفا نے اڑائی
کہ میں تو بڑا بے وفا آدمی ہوں

پرانے زمانے سے آیا ہوں، لیکن
حقیقت یہی ہے، نیا آدمی ہوں

میں دیکھ اور سن بھی رہا ہوں سبھی کچھ
میں سویا نہیں، جاگتا آدمی ہوں

بظاہر تو لگتا نہیں ہوں حسینی
مگر کربلا کربلا آدمی ہوں

مرے پاس آتے ہی جل جاؤ گے تم
میں کچھ اس قدر دل جلا آدمی ہوں

یہ ثابت کیا برق رفتاریوں سے
خلا کے سفر میں ہَوا آدمی ہوں

دوبارہ کوئی چاک پر رکھ دے مجھ کو
شکستہ ہوں، ٹوٹا ہوا آدمی ہوں

مرا ذکر ماضی کے صیغے میں کرنا
بس اتنا سمجھ لو، گیا آدمی ہوں

نہ جانے میں کب مار ڈالوں گا خود کو
نسیمِ سحر، سر پھرا آدمی ہوں

نسیمِ سحر

غزلیں

عیشِ دُنیا سے مجھے کوئی سروکار نہیں
فقر منزل ہے مِری، درہم و دینار نہیں

زین کَس رکھی ہے اور باگ پکڑ رکھی ہے
کون کہتا ہے کہ مَیں چلنے کو تیار نہیں

کس لیے پھرتی ہے دُنیا مرے آگے پیچھے
اِس سے مَیں بات بھی کرنے کا روادار نہیں

رحلِ دل پر مجھے رکھیے نہ کہ طاقِ در پر
مصحفِ شوق ہُوں مَیں پرزۂ اخبار نہیں

خاور اعجاز

بارہا ہم نے تکلّف کیا، جا کر لائے
زندگی کون تجھے روز منا کر لائے

مار ڈالیں گے وہی لوگ مجھے چھاؤں میں
جو مجھے دھوپ کے چنگل سے چھڑا کر لائے

حشر تک دیکھا کیے روز پلٹ کر اُس کو
ایک ہی خواب جو دُنیا سے بچا کر لائے

میرے لفظوں کے دیے کچھ بھی نہ کام آپائے
لوگ کہتے رہے تقریر دھواں دھار نہیں

ہاں میں ہاں روز مِلانے کے ہم عادی ہی سہی
کیا بُرا ہے جو کہیں زور سے اِک بار "نہیں"

میری مسند سے مجھے روز گرانے والے
آخری دن مجھے شانوں پہ اُٹھا کر لائے

کب بھلا جاگتا مَیں نیند کا ماتا لیکن
لانے والے تری آواز سنا کر لائے

غزل

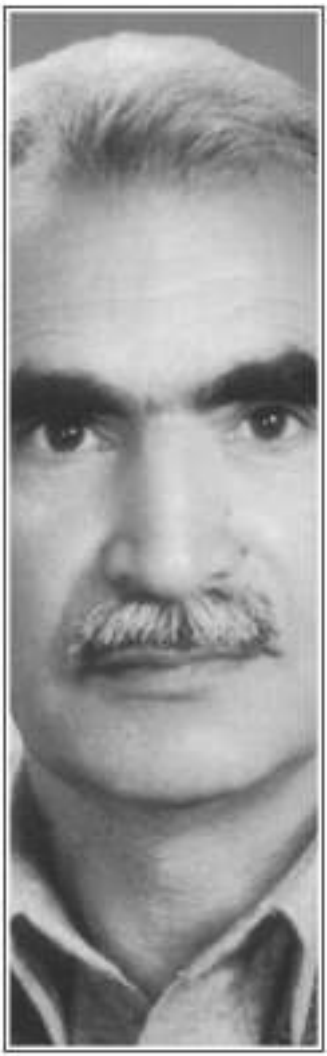

لکھا ہے جو کبھی کچھ بھی ذہول ہے میرا
شمول اہلِ قلم میں فضول ہے میرا

کیا وہی ہے جو آیا ہے جی میں، درحقِ خویش
نہ قاعدہ ہی نہ کوئی اصول ہے میرا

براہِ راست نہ بالواسطہ کوئی پیغام
خدا نہیں ہوں نہ کوئی رسول ہے میرا

بس ایک نقطۂ موہوم ہوں ریاضی کا
نہ کوئی عرض ہے میرا نہ طول ہے میرا

ہے خط نقاطِ مسلسل سو خط میں ہوں موجود
جو اس حساب سے ہونا قبول ہے میرا

کہا نہ سوچ سمجھ کر بلی بوقتِ اَلَست
خرد نہیں بخدا دل عجول ہے میرا

تمیزِ باطل و حق ہی نہ فہم وہم و یقیں
جبھی تو عرف ظلوم و جہول ہے میرا

بغیر پھول جو پھلتے نہیں ہیں اور اشجار
مثالِ تین* ہوں بس پھل ہی پھول ہے میرا

میں ناگزیر نہیں بہرِ ایں جہاں سو اہم
خروج اس سے نہ اس میں دخول ہے میرا

محمد ارشاد

*تین (Fig، انجیر)

غزل

رات کو کہنے لگیں ہم رات کیا ممکن نہیں؟
ہو ہمارے لب پہ ہر سچ بات کیا ممکن نہیں؟

دم بدم ہو پیار کی برسات کیا ممکن نہیں؟
اس قدر بدلیں یہاں حالات کیا ممکن نہیں؟

بدگماں اک دوسرے سے ہو نہ پائیں دل کبھی
ذہن سے مٹ جائیں سب خدشات کیا ممکن نہیں؟

مطمئن اور مست اپنے حال میں ہو ہر کوئی
دور ہو جائیں سبھی خطرات کیا ممکن نہیں؟

آؤ مل کر بانٹ لیں آپس کے سارے رنج و غم
آخرش ہو جائیں کم صدمات کیا ممکن نہیں؟

سب دل و جاں سے کریں اک دوسرے کا احترام
یاد سب رکھیں خدا کی ذات کیا ممکن نہیں؟

جو کریں گے قولِ قائدؒ سے وفا وہ پائیں گے
اتحاد و نظم کی برکات کیا ممکن نہیں؟

دیکھنا اک دن کریں گے جان و دل نذرِ وطن
آفریں کے بھی ہوں یہ جذبات کیا ممکن نہیں؟

رشید آفرین

غزل

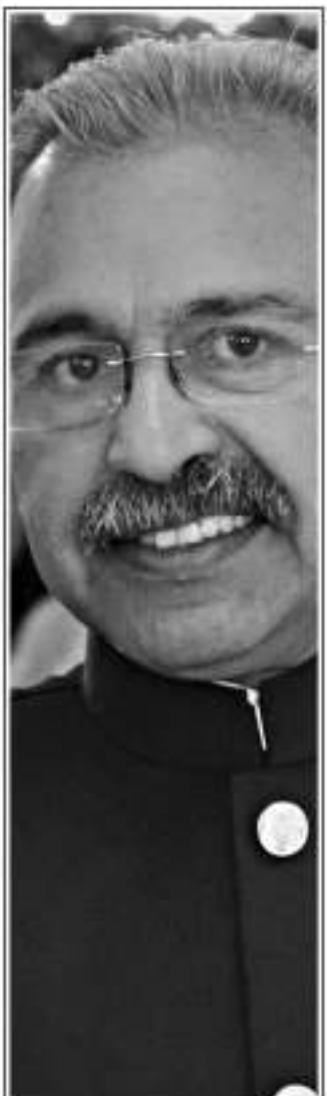

موسم کا ارادہ ہے خطرناک خدا خیر
بارود نہ بن جائے کہیں خاک خدا خیر

آتے ہیں نظر اب تو پرندوں کی جگہ پر
اُڑتے ہوئے پتے خس و خاشاک خدا خیر

اُس حسن سے بپھرے ہوئے لشکر کے مقابل
میں اور مرا پیراہنِ صد چاک خدا خیر

خود اپنے بنائے ہوئے بت توڑ کے دیکھو
گردوں پہ پہنچنے کو ہے ادراک خدا خیر

نکلا نہ اندھیرے سے مری صبح کا سورج
بے کار گئی گردشِ افلاک خدا خیر

اُس شہر کا بچنا بڑا دشوار ہے راحت
ہر آنکھ جہاں رہتی ہے نمناک خدا خیر

راحت سرحدی

غزل

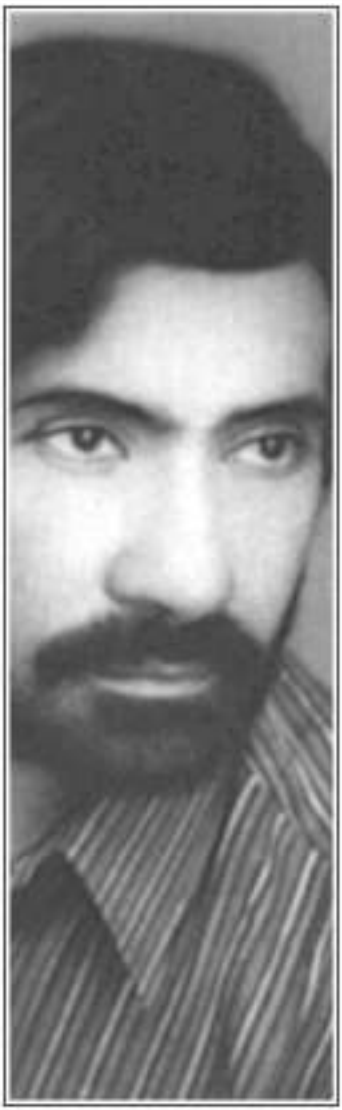

لائے ہیں پیغام کسی کا مست، نشیلے موسم
رنگ رنگیلے، چھیل چھبیلے اور سجیلے موسم

اب بجھتی سوچوں کے خالی کاسے بھر جائیں گے
کرنیں بانٹ رہے ہیں اندر کے چمکیلے موسم

پھر لہجوں میں تلخی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے
کانچ کی بستی میں پھر اُترے ہیں پتھریلے موسم

سوچ کی دھرتی سے ہوں دور اگر پتھر اور کانٹے
رنگ بکھیریں کومل جذبوں کے شرمیلے موسم

آہوں سے اکثر اندر کے طوفاں تھم جاتے ہیں
غم کی آگ بجھاتے ہیں اشکوں کے گیلے موسم

چاہت کے اِن پھولوں کو اللہ سلامت رکھے
اب کے جو بن پر ہیں نفرت کے زہریلے موسم

وہ آ جائیں تو لہرائیں رنگ جلال فضا میں
وہ آ جائیں تو پھر چھیڑیں گیت رسیلے موسم

سید قاسم جلال

غزلیں

جس سے ہر شخص ہے بیزار، بدل ڈالیں گے
ہم سیاست کا یہ معیار بدل ڈالیں گے
جس نے لوٹا ہے مرے دیس کی مٹی کا سہاگ
اس کہانی سے وہ کردار بدل ڈالیں گے
میں نہ کہتا تھا، کہ یہ لوگ تو سوداگر ہیں
ترے اجداد کی اَقدار بدل ڈالیں گے
تو نے سینچا ہے جسے اپنے لہو سے برسوں
یہ تو پَل بھر میں وہ گلزار بدل ڈالیں گے
سُن اے نیلام گھروں تک ہمیں لانے والے!
ہم ترا مصر کا بازار بدل ڈالیں گے

ہم نے سامانِ سفر باندھ لیا، باندھ لیا
اب ترے ظلم کے آثار بدل ڈالیں گے
یاد رکھنا کہ وہ دن دور نہیں، جب یہ نظام
بخدا! ہم سے گنہگار بدل ڈالیں گے
جس میں محصور ہے اس دور کا انسان، انیسؔ
اُس قفس کے در و دیوار بدل ڈالیں گے

محمد انیس انصاری

اس کنول فام کو پہلو سے گزرتے دیکھا
پھر وہ دن آیا، ان آنکھوں میں اُترتے دیکھا

آخری بار، یہ دل اُس کی پناہوں میں ملا
پھر افق پر نہ یہ سورج سا اُبھرتے دیکھا

شہرِ آذر میں نہ تھا ہم سے وصال آسودہ
روز پتھر پہ تجھے ہنستے، سنورتے دیکھا

زندگی اُڑ گئی جنگل کی ہوا کی مانند
اِس نے مجھ آبلہ پا کو نہ ٹھہرتے دیکھا

شام کے پہلے ستارے کی تمنا میں انیس!
بارہا قافلۂ شوق بکھرتے دیکھا

غزل

باقی احمد پوری

وفا ذرا بھی نہیں بے وفا کے لہجے میں
ہمیشہ بات کرے ہے جفا کے لہجے میں

وہ اجنبی ہے اسے پہلی بار دیکھا ہے
پکارتا ہے مگر آشنا کے لہجے میں

میں چاہتا ہوں وہی بات بار بار سنوں
جو بات اس نے کہی تھی حیا کے لہجے میں

جلال شاہ سے مرعوب ہو نہیں سکتا
فقیر بات کرے گا انا کے لہجے میں

خدائی لہجہ خدا کو ہی زیب دیتا ہے
بشر ہوں میری صدا ہے دعا کے لہجے میں

سزا سے بڑھ کے سزا ہے معاف کر دینا
وہ عدل کیا ہے جو بولے سزا کے لہجے میں

بلندیوں پہ میں اپنی ہی گونج سنتا ہوں
مرا ہی لہجہ ہے کوہ ندا کے لہجے میں

ہوا چراغ بجھانے جب آئے گی باقیؔ
چراغ بات کریں گے ہوا کے لہجے میں

غزل

لب و رُخسار سے آگے کی غزل
بُن رہا ہوں نئے کینڈے کی غزل

راس آئی نہ محل والوں کو
جب کہی کچے گھروندے کی غزل

خُوب ہے گیت سا پیکر اُس کا
خوب ہے اُس کے سراپے کی غزل

پھر سے پَر تول کے پرکھا خود کو
سُن کے محصور پرندے کی غزل

کچھ غزل اُس نے لکھی رومانی
اور کچھ اپنے عقیدے کی غزل

پہلے مسمار کیا ہے خود کو
پھر کہی اپنے ہی ملبے کی غزل

میری پہچان بنے گی اک دن
میرے مہکے ہوئے لہجے کی غزل

عام سی ایک غزل ہے یہ تو
آپ کہتے رہیں کانٹے کی غزل

ایسی مجبور فضا میں کہیے
راشدؔ انکار کے نعرے کی غزل

ممتاز راشد لاہوری

غزل

خیالِ رفتگاں ہے اور میں ہوں
غمِ دل زادگاں ہے اور میں ہوں

اکیلا ہو گیا ہوں رفتہ رفتہ
ہجومِ کشتگاں ہے اور میں ہوں

بھٹک جانے کی خوشیاں ہی عجب ہیں
خمارِ سرگراں ہے اور . میں ہوں

اُسے مطلوب تھا بھی اور ہوں بھی
یہی حُسنِ گماں ہے اور میں ہوں

مجھے خاموش رہ کر بولنا ہو
زباں، جادو بیاں ہے اور میں ہوں

کسے اندوہ کی بھٹی میں جھونکا
معطر سا دھواں ہے اور میں ہوں

بکھرتا جا رہا ہوں رفتہ رفتہ
دلِ آوارگاں ہے اور میں ہوں

پرویا ہے جو صدیوں میں زمانہ
یہ رختِ کارواں ہے اور میں ہوں

جو پیش و پس میں گذری جا رہی ہے
یہ عمرِ رائیگاں ہے اور میں ہوں

جبینِ وقت پر مرقوم اصغؔر
ادھوری داستاں ہے اور میں ہوں

علی اصغر عباس

غزل

حضورِ شاہ سے صدا کے انتظار میں
کہ شانے جھڑ گئے قبا کے انتظار میں

اُٹھیں گے ایک دن سوال بن کے دوستو
جو سر ڈھلک گئے ردا کے انتظار میں

بپا بھی حشر ہو چکا، کہ وقت سو چکا
ہیں لوگ جانے کس صدا کے انتظار میں

خبر نہیں وہ شخص تھا کہ محض حرف تھا
کہ کوئی برگ تھا صبا کے انتظار میں

مسافروں نے تنگ آ کے حبس بو لیا
سفر کے صحن میں، ہوا کے انتظار میں

سدا سے میری دھڑکنوں میں جاگتا ہے وہ
میں سو رہا ہوں جس خدا کے انتظار میں

طلوعِ فجر کی گھڑی ہے جاگ خواب سے
درِ قبول ہے دعا کے انتظار میں

حامد یزدانی

غزل

کِس قیامت پہ نظر کر کے ابھی لوٹا ہوں
اپنے اندر کا سفر کر کے ابھی لوٹا ہوں

اِک ستارے کو کروں گا ابھی روشن جا کر
ایک قطرے کو گہر کر کے ابھی لوٹا ہوں

تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں لیکن
شب ستاروں پہ بسر کر کے ابھی لوٹا ہوں

کوئی آسان نہ تھا سچ کی حمایت کرنا
میں یہی کام مگر کر کے ابھی لوٹا ہوں

ایک زنجیر کو کاٹا ہے نظر سے میں نے
ایک دیوار میں در کر کے ابھی لوٹا ہوں

ریاض رومانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفادار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

غزلیں

ساتھ سورج کے اب کھڑا ہوں میں
اپنے سائے سے تو بڑا ہوں میں

مجھ کو حیرت سے دیکھنے والو!
ہجر کی دھوپ میں سڑا ہوں میں

ڈھنگ کا خواب دیکھنے کے لیے
عمر سے نیند میں پڑا ہوں میں

اوصاف شیخ

دمکتا رخ لیے جو کر وفر سے نکلا ہوں
میں بیچ کے معرکۂ خیر و شر سے نکلا ہوں

میں پھونک پھونک کے رکھتے ہوئے قدم گیا تھا
میں رقص کرتے ہوئے اس نگر سے نکلا ہوں

ہوں گرد باد کی صورت جو اردگرد ترے
یہ جان لے تری گردِ سفر سے نکلا ہوں

وہ جس کے سائے میں تم نے دبا دیا تھا مجھے
میں آج پھر اسی بوڑھے شجر سے نکلا ہوں

اس کی منزل تو ہے ندی کے پار
اب میں سمجھا فقط گھڑا ہوں میں

خود سے اوصاف جنگ ہے میری
خود سے ہی عمر بھر لڑا ہوں میں

میں تیرے ساتھ ازل سے نہیں ہوں سچ کہہ دوں
ترے سفر میں کسی رہگزر سے نکلا ہوں

میں کب سے گم ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں ملتا
میں خود کو ڈھونڈنے اوصاف گھر سے نکلا ہوں

غزل

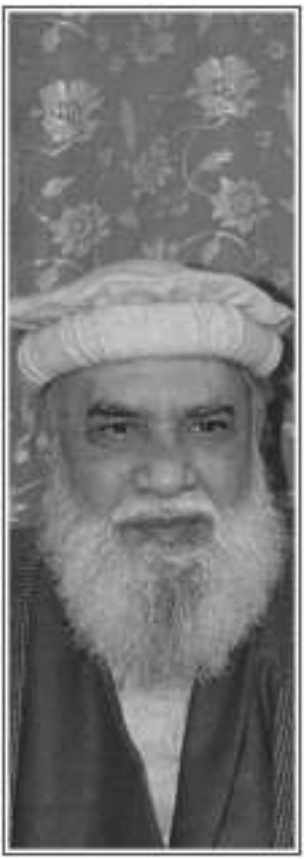

لیتا ہے تیرا کیا بھلا بوڑھا شجر نہ کاٹ
اس پر ہیں دیکھ کتنے پرندوں کے گھر نہ کاٹ

اچھا ہے کام، شوق سے پودے نئے لگا
لیکن خدا کا نام ، تناور شجر نہ کاٹ

کرنے دے انحصار سبھی کو اڑان پر
منصف ہے تو کسی بھی پرندے کے پر نہ کاٹ

اکرم خدا کا نام کہیں گھر بنا کے بیٹھ
جیون سفر کو اس طرح تو در بدر نہ کاٹ

اکرم ناصر

راہ گم کردے نہ وہ، اِن راستوں کی بھیڑ میں
واپسی کا، اے زمیں! رستہ نکال اُس کے لیے

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

بجز خدا کے کسی کو اگر پکارا ہے
یہی تو زیست کا سب سے بڑا خسارا ہے

رکاوٹوں سے اُلجھنے کا شوق ہے ہم کو
ہمارے واسطے طوفان بھی کنارا ہے

بہار غنچہ و گل باغ میں مہکتی ہے
یہ اہلِ دل کو ملاقات کا اشارا ہے

بس اک نظر تمھیں دیکھا تو یوں لگا مجھ کو
کہ آسماں سے خدا نے تمھیں اتارا ہے

بچھڑ رہے ہو جو مجھ سے تو یاد بھی رکھنا
یہ فیصلہ بھی تو میرا نہیں تمھارا ہے

کوئی بھی داغ نہ افروز اب لگے گا اِسے
رُخِ حیات کو کچھ اس طرح سنوارا ہے

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

غزل

طلعت شبیر

دیکھ تو اعتبار کرتے ہیں
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

ہو شبِ ہجر یا غمِ دوراں
تیری بخشش شمار کرتے ہیں

گو کہ مبہم سی اک شکایت ہے
کتنے سادہ ہیں یار کرتے ہیں

تذکرے پھر وہی وفاؤں کے
دیکھ لو! بار بار کرتے ہیں

سلسلے یوں کٹھن مسافت کے
زندگی میں شمار کرتے ہیں

اُس کے وعدے کا گو یقین نہیں
پھر بھی ہم اعتبار کرتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی ، جان لیا البتّہ

غزلیں

ترے انکار سے، اقرار سے ڈر لگتا ہے
دھوپ سے، سایۂ دیوار سے ڈر لگتا ہے

نیند آتی ہے تو سونے نہیں دیتا خود کو
خواب اور خواب کے آزار سے ڈر لگتا ہے

ہم تو اپنوں کی عنایت سے پریشاں ہیں میاں
کب ہمیں شورشِ اغیار سے ڈر لگتا ہے

روز بڑھ جاتی ہے کچھ درجہ گھٹن سینے کی
روز کٹتے ہوئے اشجار سے ڈر لگتا ہے

اب کہاں کوئی خریدار زلیخا جیسا
اس لیے مصر کے بازار سے ڈر لگتا ہے

آپ کو کیسے خریدار بھلے لگتے ہیں !!
آپ کو کیسے دکاں دار سے ڈر لگتا ہے!!

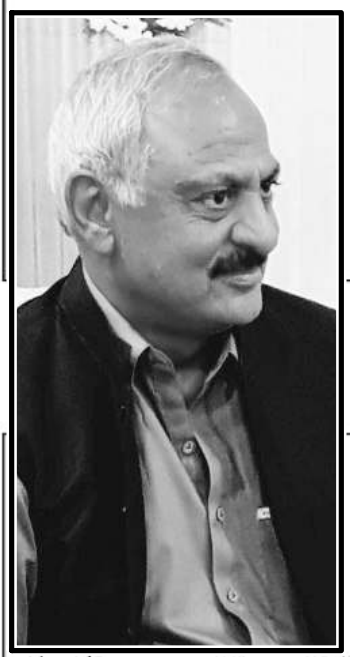

افتخار شاہد

فقیروں کی صداؤں سے کھُلا ہے
فقیروں کو یہ در اچھا لگا ہے
ثمر کے بوجھ سے شاخیں جھکی ہیں
پرندوں کو شجر اچھا لگا ہے
پسِ پردہ تمہارا ڈانٹنا بھی
مرے بیدادگر اچھا لگا ہے
وہ سب کے حال سے واقف ہے لیکن
بظاہر بے خبر ! اچھا لگا ہے
تری بے فیض بستی سے نکل کر
بھٹکنا دربدر اچھا لگا ہے

کشیدہ قامتی پسرِ علی کی
سرِ نیزہ وہ سر اچھا لگا ہے
اگرچہ آئنے چٹخے پڑے ہیں
مگر وہ دیدہ ور اچھا لگا ہے
دیا جو طاق میں جلتا تھا شاہد
تمہارے بام پر اچھا لگا ہے

غزل

یعقوب پرواز

خود سوچ لو کہ مسئلہ کیسا ہے سامنے
پیچھے عدو کی فوج ہے ، دریا ہے سامنے

آنکھیں بھند کہ بھیڑ میں کھویا ہوا ہے وہ
دل کہہ رہا ہے دیکھ وہ تنہا ہے سامنے

کب تک رہو گے ہوش میں اے دل گرفتگار
اک حشر خیز قامتِ زیبا ہے سامنے

کیوں چھیڑیے قیامتِ رفتہ کا تذکرہ
مت بھولیے کہ محشرِ فردا ہے سامنے

آخر کوئی تو ہے مری تشویش کا سبب
آدھا سفر تو کٹ گیا ، آدھا ہے سامنے

سیدھے سجاؤ بات بھی کرتا نہیں ہے وہ
پرواز کیسا مسئلہ ٹیڑھا ہے سامنے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

غزل

جہاں ، میں کون کسی کا خیال رکھتا ہے
ہر ایک شخص بس اپنا ملال رکھتا ہے

اسے خبر ہے کہ میں کچھ نہ اس کے مانگوں گا
وہ کچھ نہ کچھ مری جھولی میں ڈال رکھتا ہے

میں اس کی چھاؤں میں اکثر کتابیں پڑھتا ہوں
شجر یہ گھر کا ہی مجھ کو نہال رکھتا ہے

مگر یہ قصۂ پارینہ ہوتا جاتا ہے
یہ خط ہی رابطہ اس سے بحال رکھتا ہے

وہ اپنے ساتھ کسی کو بھی دیکھ سکتا نہیں
ہُنر میں اپنے وہ یوں تو کمال رکھتا ہے

مری زمین ابھی تک سنبھل نہیں پائی
لہو میں سانحے کتنے یہ سال رکھتا ہے

ہارون الرشید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میں خاک ہو کے بھی اس خوف سے نہ خاک ہوا
ہوائیں ترک نہ کر دیں یہ آستاں کہیں

غزل

کتنی آسانی سے کہسار اُٹھا لیتا ہوں
میں ترے عشق کا آزار اُٹھا لیتا ہوں

ہار جاتا ہے مرے ظرف سے سیلِ گریہ
میں تو پلکوں پہ یہ انبار اُٹھا لیتا ہوں

چھوڑ دیتی ہے جسے عشق سمجھ کر دنیا
میں وہی سنگِ گراں بار اُٹھا لیتا ہوں

موسمِ گُل کا میں رستا نہیں دیکھا کرتا
عجلتِ شوق میں بس خار اُٹھا لیتا ہوں

مجھ کو پیڑوں سے گزارش نہیں کرنا پڑتی
اپنے حصے کے میں اثمار اٹھا لیتا ہوں

اک جھلک بھی جو میسر نہیں ہوتی طالب
سر پہ میں کوچۂ دل دار اٹھا لیتا ہوں

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کاش آنکھوں کو آ لیں جالے
ہونٹوں پر تالے پڑ جائیں

غزل

ملے گا کیسے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے
وہ شہر آ تو گیا ہے بچھڑ کے گاؤں سے

بتا رہے ہیں دھوئیں کی لکیر کے تیور
چراغ لڑتا رہا دیر تک ہواؤں سے

مری زمین سے بہتر کوئی جہان نہیں
میں لوٹ آیا ہوں اجڑی ہوئی خلاؤں سے

مفاہمت کسی فرعون سے نہیں کی ہے
اُلجھتے آئے ہیں ہر دور کے خداؤں سے

حسینیت کا علم جو اُٹھا کے چلتے ہیں
جلیل ڈرتے کہاں ہیں وہ کربلاؤں سے

احمد جلیل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

غزلیں

بھول کر تلخیِ حالاتِ زبوں ، بولتے ہیں
برسرِ دار و رسن ، اہلِ جنوں ، بولتے ہیں

پھر زمانے پہ تسلّط ہے کسی سامری کا
شہر در شہر یہ اثراتِ فسوں ، بولتے ہیں

ہم جو بولے تو سبھی اہلِ قضا بول اُٹھے
بولنے والے اگر بولیں تو یوں بولتے ہیں

پیش آتی ہے جہاں ، بیعتِ طاغوت کی بات
پھر وہاں ، نام و نسب ، غیرت و خوں بولتے ہیں

اہلِ دنیا کی نظر میں ہیں وہ شاعر ، شوکت
لے کے جو سوزِ جگر سوزِ دروں بولتے ہیں

شوکت محمود شوکت

بے کلی دل کی بڑھی ہے ، خیر ہو
زندگی مشکل ہوئی ہے ، خیر ہو

شام ہوتے ہی کسی کی یاد ، پھر
بے سبب آنے لگی ہے ، خیر ہو

سارے عالم میں عدوئے جان ، اب
آدمی کا آدمی ہے ، خیر ہو

پھر بہاریں سوئے گلشن ہیں رواں
وحشتِ دل دیدنی ہے ، خیر ہو

بے وفائی کا گلہ بے سود ہے
حسن کی فطرت یہی ہے ، خیر ہو

میں نے اظہارِ محبت کر دیا
بات دل کی کر ہی دی ہے ، خیر ہو

آج شوکت ، اس قدر ہونٹوں پہ کیوں
رقص فرما خامشی ہے ، خیر ہو

غزل

جسارت خیالی

نہ خوابوں کے جزیروں میں بسر کر
تلاشِ منزلِ نو میں سفر کر

مٹا پہلے تو ظلمت ہر طرف سے
بڑے پھر شوق سے جشنِ سحر کر

چھپے ہیں لعل بھی کیسے صدف میں
کبھی تو دیکھ دریا میں اُتر کر

گوارا ہیں یہ فاقے بھی خوشی سے
ہمیں گھر سے نہ اپنے دربدر کر

جو ہیں منقار زیرِ پر جسارت
اُنھیں صرصر کی زد سے باخبر کر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے احتیاج یہ نمِ غم تاب اور ہے
سلکِ مژہ میں اک درِ ناب اور ہے

غزل

کسی کے ہونٹوں پہ پیاس دیکھی کسی کے ہاتھوں میں جام دیکھا
بس اپنی دھرتی پہ ہم نے برسوں یہی فسردہ نظام دیکھا

محبتوں کا رواج دیکھا نہ چاہتوں کا سماج دیکھا
خلوص و مہر و وفا کا پیکر کوئی نہ ہم نے امام دیکھا

یہاں امیر و وزیر دیکھے سبھی صغیر و کبیر دیکھے
اَنا کا جو بھی اسیر دیکھا وہ خواہشوں کا غلام دیکھا

بغیر محنت کے پاؤ عزت کہ یہ اصولِ جہاں نہیں ہے
یہاں تو جس نے بھی کی ریاضت اُسی کا اُونچا مقام دیکھا

وہ جس نے اپنے لہو سے بخشا نکھار اقبال اِس جہاں کو
اُسی لہو سے لکھا ہوا میں نے اپنے دل پہ وہ نام دیکھا

اقبال سرو بہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اُٹھ نہ پائے نظر داستاں گو ، اگر
شام کا ذکر وقتِ سحر چھیڑ دیں

غزل

اُس گھر کی خموشی دیدنی تھی
آواز کسی کی گونجتی تھی

زخموں سے بدن تھا چُور میرا
آنکھوں میں تھکن شکست کی تھی

میں بُجھتا ہوا دیا تھا لیکن
ہر سمت مری ہی روشنی تھی

رہرو سے بچھڑ رہے تھے رستے
اور پاؤں سے خاک اُڑ رہی تھی

جاگا ہوا تھا وجود اُس کا
وہ پاس مرے کھڑی ہوئی تھی

پہچان نہیں سکا میں اُس کو
اک دم وہ قریب آ گئی تھی

میں چھوڑ گیا ظہور خود کو
اور مجھ میں وہ بیٹھی رو رہی تھی

ظہور چوہان

غزل

جھیل جیسی مجھے لگیں آنکھیں
حال مجھ سے مِرا کہیں آنکھیں

اُس کی خوشبو سمٹنے لگتی ہے
مُجھ سے جب گفتگو کریں آنکھیں

یہ مِری روح کی امانت ہیں
دُکھ جہاں بھر کے کیوں سہیں آنکھیں

ایک دوجے سے کیسے ملنا ہے
مُجھ سے چُھپ چُھپ کے یہ کہیں آنکھیں

دِل کی حالت عجیب ہوتی ہے
آگ کی طرح جب جلیں آنکھیں

حالِ دِل کی اُنھیں خبر ہو جائے
وُہ اگر غور سے پڑھیں آنکھیں

کاش یہ معجزہ بھی ہو جائے
میری جانب تِری بڑھیں آنکھیں

تاک میں ہوں میں ایسے منظر کی
جُھک کے اِک بار وہ اُٹھیں آنکھیں

روح تک روشنی اُتر جائے
گر سہارا مِرا بنیں آنکھیں

میرا دِل باغ باغ ہو جائے
میرے رستے میں جب بچھیں آنکھیں

رونے لگتا ہے میرا دِل تاثیر
میری حالت پہ جب ہنسیں آنکھیں

تاثیر نقوی

غزلیں

ہم ذرا دیر ہی رونے سے بہل جاتے ہیں
اشک پلکوں میں پرونے سے بہل جاتے ہیں
ہم سے خاموش صفت لوگ بھی ہوتے ہیں عجب
اِک دلاسے کے کھلونے سے بہل جاتے ہیں
کتنے محروم تمنا ہیں غریبوں کے عیال
جو کہ خواہش کے بچھونے سے بہل جاتے ہیں
اپنی قسمت میں کہاں بارشِ نکہت، ہم تو
ہاتھ بوندوں میں بھگونے سے بہل جاتے ہیں
کون ہوتے ہیں جو فرصت سے سنورتے ہوں گے
ہم فقط چہرے کو دھونے سے بہل جاتے ہیں

ہم نے کُرتے پہ بٹن ٹانکنے والی سے کہا
ہم تری سوئی چبھونے سے بہل جاتے ہیں
یہ حویلی کا بڑا صحن مبارک ہو تمھیں
ہم سے نادان تو کونے سے بہل جاتے ہیں
اپنا ہوتا وہ اگر غیر نہ ہوتا شاعرؔ
ہم اِسی ہونے نہ ہونے سے بہل جاتے ہیں

شاعر علی شاعر

گردِ ملال چہرے پہ مَلتا رہا ہوں مَیں
سڑکوں پہ دھوپ اوڑھ کے چلتا رہا ہوں مَیں

کارِ ہنر ہے کوئی نہ کارِ نمایاں کچھ
سائے کا کام ڈھلنا ہے، ڈھلتا رہا ہوں مَیں

وعدہ ہوں اور وعدے کی تقدیر کی طرح
فردا کے روز روز پہ ٹلتا رہا ہوں مَیں

دنیا کی ٹھوکروں نے ہی جینا سکھایا ہے
رہ رہ کے تیرگی میں اُجلتا رہا ہوں مَیں

دیوار و در میں قید رہا ساری زندگی
کہنے کو روز گھر سے نکلتا رہا ہوں مَیں

اوروں کا دو قدم بھی سہارا نہیں لیا
گر گر کے اپنے آپ سنبھلتا رہا ہوں مَیں

شاعرؔ نہیں ہے مجھ کو مقدر سے کچھ گلہ
سورج ہوں اپنی آگ میں جلتا رہا ہوں مَیں

غزل

چاہتوں کے پیروں میں بیڑیاں نہیں ہوتیں
قُربتیں جو دل میں ہوں دُوریاں نہیں ہوتیں

بارشیں نہیں ہوتیں اُس کے گھر میں رحمت کی
جس کسی کے آنگن میں بیٹیاں نہیں ہوتیں

جو بھی ہیں حریفِ جاں، اُن سے جا کے کہہ دینا
مرد کی کلائی میں چوڑیاں نہیں ہوتیں

ظلم و جَور سے عاری جو زمین ہوتی ہے
زلزلے نہیں ہوتے ، آندھیاں نہیں ہوتیں

اَن گنت مکاں ایسے، اِس وطن میں دیکھے ہیں
جن میں پیٹ بھرنے کو روٹیاں نہیں ہوتیں

انتظام رہتا ہے ، گھر کا مُستقل برہم
مان لو ! سُگھڑ جن کی بیویاں نہیں ہوتیں

اے ندیمؔ شامل ہو جب خلوص نیت میں
کوششیں کسی کی بھی رائیگاں نہیں ہوتیں

ریاض ندیم نیازی

غزلیں

اذیتوں کا نیا سلسلہ تو ہونا تھا
کچھ اس لیے بھی تجھے اب جدا تو ہونا تھا

کہ پہلی بار سفر اور وہ بھی تنہا سفر
کہ پاش پاش مرا حوصلہ تو ہونا تھا

جب ایک عمر ہوئی تیرگی نگلتے ہوئے
مرا چراغ سے اب سامنا تو ہونا تھا

عجیب شخص ہے، عجلت میں کاٹ بیٹھا ہے
وگرنہ پیڑ تھا، آخر ہرا تو ہونا تھا

ہمارے بیچ محبت شدید تھی ارشاد
ہمارے بیچ بہت فاصلہ تو ہونا تھا

ارشاد نیازی

سوزِ دروں کو آنکھ سے باہر نکال کر
ہر شاخ رکھ رہی ہے گُلِ تر نکال کر

لائے حسین آخری لشکر نکال کر
خیمے سے تشنہ لب علی اصغر نکال کر

تھوڑے ہی دن ہے شاخِ شجر پر یہ نغمگی
اڑ جائیں گے یہ لوگ نئے پر نکال کر

اہلِ نظر کے سامنے رکھتا ہوں دیکھ لیں
لایا ہوں مشتِ خاک سے گوہر نکال کر

یوں بھی ہو مجھ کو چشمِ فنا ڈھونڈتی پھرے
رکھ دوں میں روح جسم سے باہر نکال کر

اس داستاں میں اور تو کچھ بھی نیا نہیں
اس کے بچھڑتے وقت کا منظر نکال کر

کرتا ہوں سجدہ آپ میں اپنے جمال کو
پتھر سے اک خیال کا پیکر نکال کر

اب شاعری میں اور کسی کو بھی دیں جگہ
مجذوب و مست و فقر و قلندر نکال کر

شہروں کی بود و باش نے وحشی کیا اسے
پھرتا ہے قیس ہاتھ میں خنجر نکال کر

غزل

کیے جاتا ہے پانی کو شراب آہستہ آہستہ
سمندر میں اتر کے ماہ تاب آہستہ آہستہ

ابھی وہ آنکھ اٹھے گی، ابھی وہ آنکھ پر کھے گی
کئی قسطوں میں ہوگا احتساب آہستہ آہستہ

اگر بندِ قبا کھولو تو پھر اتنی لطافت سے
کہ جیسے مسکراتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

ابھی تو چند گھڑیاں ہی جدائی میں گزاری ہیں
کھلے گی خیمہِ دل کی طناب آہستہ آہستہ

کنیز اب شاہِ بوسہ زن سے یوں بھی کہہ نہیں سکتی
"حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ"

تم اُن انگڑائیوں کے رنگ کمرے میں بکھرنے دو
ملیں گے سب سوالوں کے جواب آہستہ آہستہ

ہوائے یاد کچھ ایسے خرام انداز ہے فائق
ہمارے بال ہوتے ہیں خراب آہستہ آہستہ

فائق ترابی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

غزل

جس جس کو سمجھتے ہیں بھلے لوگ یہاں پر
سب کو کھ سے ان کی لگے ہیں روگ یہاں پر

انسان کا بچّہ نہیں دنیا میں کوئی بھی
ہیں ایک سے اک آگے سبھی موگ یہاں پر

اک دوست تلاشے ہوئے عرصہ ہوا لیکن
دیکھا نہیں یاری کا کوئی یوگ یہاں پر

دوری میں بھلائی ہے تجرّد میں مزہ ہے
مڈبھیڑ سے ملتا نہیں ہے جوگ یہاں پر

شامل ہیں مرے قتل میں سارے ہی شہاب آج
جو آ کے مناتے ہیں مرا سوگ یہاں پر

شہاب اللہ شہاب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خود مرے اندر چھپا نہ ہو مرا دشمن
مجھ پہ مسلّط عجب گمان رہا ہے

غزل

حمیرا راحت

وہ مری زندگی سے بڑھ کر ہے
اُس سے ملنا خوشی سے بڑھ کر ہے

میں کہاں جانتی تھی بچپن میں
زندگی بے بسی سے بڑھ کر ہے

آج اِک دکھ ملا ہے ایسا جو
آنسوؤں کی نمی سے بڑھ کر ہے

چاند کو کیا خبر کہ میرے پاس
یاد اِک چاندنی سے بڑھ کر ہے

دل میں اُٹھا ہے آج درد عجیب
جو تمہاری کمی سے بڑھ کر ہے

ایک مجذوب نے کہا مجھ سے
عشق دیوانگی سے بڑھ کر ہے

جان جاؤ الف کا گر مفہوم
یہ ہر اِک آگہی سے بڑھ کر ہے

غزل

ہاتھ خالی تھے سو ہم کو کاسے ملے
بعد مرنے کے کتنے دلاسے ملے

ہم نے آنسو جتنے تیسری جنس کے
جب بھی ارزاں ہوئے تو خدا سے ملے

سانحوں سے مرتب کتب کھو گئیں
فن ہوا ہو گیا ، گم خلاصے ملے

از قدم تا قدم بھاگتے پھر رہے
ٹوٹ کر گر گئے تب دعا سے ملے

بھول جانا ہنر ہے ، نہیں آ سکا
عشق میں کچھ دفینے خطا سے ملے

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

غزل

کُھل نہ پایا ہے راستہ مجھ پر
اس نے باندھا ہے فاصلہ مجھ پر

بارہا آئنے میں دیکھا ہے
عکس میرا نہیں ، کھلا مجھ پر

میری پوشاک کتنی اُجلی تھی
تُو نے الزام دھر دیا مجھ پر

کُھل گئی اپنے آپ پر جب میں
منکشف تو بھی ہو گیا مجھ پر

زندگی کی غزل ادھوری ہے
کتنا بھاری ہے قافیہ مجھ پر

ذکر کرنا نہیں محبت کا
یہ بھی تھا ایک سانحہ مجھ پر

ہجر میں کیسی ہوگئی حالت
طنز کرتا ہے آئنہ مجھ پر

آتے جاتے ہی دیکھ لیتے ہیں
یہ بھی احساں ہے آپ کا مجھ پر

میں غزل جیسی ہو گئی لبنیٰ
شعر اس نے کوئی کہا مجھ پر

لبنیٰ صفدر

غزل

راستے میں چھپے ہیں کئی راستے
مذہبی راستے منطقی راستے

چاہ منزل کی کوئی رہی ہی نہیں
آگہی بن گئے ہیں یہی راستے

تیسرا تو کوئی راستہ ہی نہیں
دوستی راستے ، دشمنی راستے

ہجر میں کائناتیں بھی ٹھوکر لگیں
وصل ہو تو کریں شاعری راستے

تیری یادوں کو منزل بنا لیتے ہیں
ہم سے کرتے ہیں جب سرکشی راستے

ہم فرشتوں سے افضل تھے روشن کبھی
کھا گئے ہیں ہمیں سرسری راستے

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس شان کے پیوند ہیں کیا چاک قبا ہیں
صحرا کے بگولے جری گلیوں میں گدا ہیں

غزل

پتھروں میں گُلاب دیکھتا ہوں
اپنی مرضی کے خواب دیکھتا ہوں

آنکھ سے وہ دِکھائی دیتا نہیں
دِل سے میں بے حساب دیکھتا ہوں

تیر و تلوار دیکھ تُو ظالم
میں قلم اور کِتاب دیکھتا ہوں

تُو بھی کر میرے سب گُناہ شمار
میں بھی تیرا ثواب دیکھتا ہوں

دیکھتا ہے تُو شب میں تاریکی
اور میں ماہتاب دیکھتا ہوں

ایک اندھے نے ڈرتے ڈرتے کہا
دیکھتا ہوں ، جناب دیکھتا ہوں

جِسم پر دیکھتا ہوں میں پیری
خواہشوں پر شباب دیکھتا ہوں

تُو عداوت کے در بناتا ہے
میں محبت کے باب دیکھتا ہوں

دیکھتا ہوں میں کائنات کو یوں
جیسے کوئی کتاب دیکھتا ہوں

اُس کے دِل میں بھری ہے آتشِ غم
اُس کی آنکھوں میں آب دیکھتا ہوں

دید کا اِک سوال ہیں آنکھیں
اُس کا چہرہ جواب دیکھتا ہوں

کب حقیقت میں دیکھتا ہوں اُسے
میں تو بس اُس کے خواب دیکھتا ہوں

راہِ حق میں جو جان ہارتا ہے
میں اُسے کامیاب دیکھتا ہوں

تُو نے دُنیا کہا جسے کیفی!
میں اُسے اک سراب دیکھتا ہوں

محمود کیفی

غزل

دل کی بستی میں وہ مہماں نہ ہوا تھا پہلے
اس طرح درد کا درماں نہ ہوا تھا پہلے

اشک پلکوں پہ ستاروں کی طرح اٹکے ہیں
شہر میں ایسے چراغاں نہ ہوا تھا پہلے

درد کی طرح تہِ آب رہا درد مگر
جس طرح آج ہے عریاں، نہ ہوا تھا پہلے

اس کو آنکھوں میں بسے خواب کی تعبیر ملی
اس کا چہرہ یوں گلستاں نہ ہوا تھا پہلے

پھر مری فکر کی دہلیز پہ موتی چمکے
یہ اُفق رنگِ شبستاں نہ ہوا تھا پہلے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

غزل

اِسے پسند اُسے نا پسند کرتے رہے
ہم اپنے آپ کو لمحوں میں بند کرتے رہے

ستارہ توڑ کے لانے کی آرزو تھی بہت
کبھی کبھار نظر کو کمند کرتے رہے

مقامِ صبر نہیں تھا مگر باہوش و حواس
ہم اپنے لہجے کی تلخی کو قند کرتے رہے

قدم قدم پہ نئی کھائیوں کے ہوتے ہوئے
تصورات کے آہو زقند کرتے رہے

لیا نہ درس کسی مدرسے سے نفرت کا
ہم اپنے دل کو سدا دردمند کرتے رہے

کمال ہے کہ بھلا کر تمام ناموں کو
بس ایک نام کا پرچم بلند کرتے رہے

ہمارے جیسا کوئی بھی سخی نہیں اعظم
حریفِ جاں کو سدا ارجمند کرتے رہے

اعظم کمال

غزل

اب عقیل اپنا چل چلاؤ ہے
عمر کا آخری پڑاؤ ہے

اس کے چہرے پہ جو دھنک ہے عقیل
اس کے ہر رنگ میں اُٹھاؤ ہے

وقت کے کھولتے سمندر میں
زندگی برف جیسی ناؤ ہے

بوند نیکی کی اپنے پاس نہیں
اور گناہوں کا اک الاؤ ہے

روز سورج نیا نکلتا ہے
شب کے سینے میں کیسا گھاؤ ہے

رات ، جنگل ہے اور سناٹا
کیسا ماحول میں تناؤ ہے

خیمۂ دل کی سب طنابوں میں
خون کا تیز تر بہاؤ ہے

میرا ہم عمر پیڑ آنگن کا
مجھ کو اس سے بڑا لگاؤ ہے

اِن کو روکو تو ہونٹ پھٹ جائیں
سچی باتوں میں وہ دباؤ ہے

عقیل رحمانی

غزل

جب شغف ہی نہیں مقام کے ساتھ
کیوں بلاتے ہو احترام کے ساتھ

قیمتی وقت دے دیا تم کو
اب تو حضرت لگاؤ نام کے ساتھ

یاد رکھنے کو کچھ تو ہو اس پاس
کچھ تو اچھا کرو غلام کے ساتھ

ساعتیں خوش تھیں جو چلی گئی ہیں
بدحواسی میں تیز گام کے ساتھ

جیتے جی تو ادھر نہ آئے گی
ہاتھ ایسا کروں گا شام کے ساتھ

یہ جو جذبات ہیں ودیعت ہیں
یہ تو ملتے نہیں ہیں دام کے ساتھ

پورے قد سے کھڑے ہیں ہم تو رضاؔ
مرحبا مرحبا امام کے ساتھ

نعیم رضا بھٹی

غزلیں

خاک کو عرش تو قطرے کو گہر کرتی ہے
یہ کرشمہ بھی فقط اُس کی نظر کرتی ہے

میں تو صدیوں کی مسافت سے پلٹ آتا ہوں
میرے پیچھے تری آواز سفر کرتی ہے

سانس کی لے ابھی کچھ اور بھی مدھم ہو گی
لحہ لحہ یہ مجھے خاک بسر کرتی ہے

کون اس دل میں اُترتا ہے گلابوں کی طرح
کس کی خوشبو مری سانسوں پہ اثر کرتی ہے

گردشِ وقت سنبھالے ہوئے پھرتی ہے مجھے
وار دشمن کی طرح شام و سحر کرتی ہے

اپنی ہی خاک سے ہوتے ہیں شرر سارے
تیز آندھی بھی تو پودوں کو شجر کرتی ہے

ٹوٹ جاتا ہے طلسم شبِ رفتہ بھی نوید
روشنی ایسے اندھیرے سے گزر کرتی ہے

محمد نوید مرزا

اُسے کوئی سزا سی ہے
زمیں صدیوں کی پیاسی ہے
میں باہر سے چمکتا ہوں
مرے اندر اُداسی ہے
نئے انسان کی دنیا
پرانی اک کتھا سی ہے
سفر جاری ہے صدیوں کا
یہ دُنیا تو ذرا سی ہے
مقابل آئنہ رکھنا
محبت خود شناسی ہے

سفر بے سمت کرتے ہو
مسلسل بدحواسی ہے
دکھوں سے چور اک لڑکی
زمانے سے خفا سی ہے
بغاوت کر نہیں سکتی
کسی مندر کی داسی ہے
خزاں آثار منظر ہیں
رُتوں کی بے لباسی ہے

غزلیں

اپنی ضرورتوں سے پریشان بھی نہیں
کہنے کو زندگی مری آسان بھی نہیں

دیوانہ بن کے شہر میں کیوں گھومتا پھروں
ایسا ابھی میں چاک گریبان بھی نہیں

کردار قتل کرکے کہانی لپیٹیے
اب اس زمیں پہ زیست کے امکان بھی نہیں

دکھ سکھ میں سب شریک تھے اِک وہ بھی دور تھا
کب صحن وہ رہے ہیں، وہ دالان بھی نہیں

جیسا تھا اُس کا ظرف وہ اُس نے دکھا دیا
مَیں اُس کی بے وفائی پہ حیران بھی نہیں

کیوں کر میں تیرے دستِ حنائی کو تھام لوں
جب تجھ کو میرے قُرب کا ارمان بھی نہیں

کچھ سوچ کر ہی راہِ محبت میں رکھ قدم
مشکل نہیں ہے گر، تو یہ آسان بھی ہیں

حق سچ کے تیرے ہاتھ میں پتوار ہوں اگر
لے چل سفینہ، راہ میں طوفان بھی نہیں

اس جلوتِ حیات میں روشن ہے آفتاب
ورنہ چراغِ شام کی پہچان بھی نہیں

آفتاب خان

زیبِ پوشاک ہونا پڑتا ہے
ورنہ ناپاک ہونا پڑتا ہے

آگ پھونکوں سے جل نہیں سکتی
خس و خاشاک ہونا پڑتا ہے

لفظ لکھ کر مٹانے پڑتے ہیں
شعر میں تاک ہونا پڑتا ہے

پھول یک دم کھلا نہیں کرتا
خاک میں خاک ہونا پڑتا ہے

جب ہو آنکھوں میں ریت صحرا کی
چشمِ نم ناک ہونا پڑتا ہے

عشق میں سادگی نہیں چلتی
کچھ تو چالاک ہونا پڑتا ہے

حسن چھونے کی آرزو ہو اگر
تھوڑا بے باک ہونا پڑتا ہے

جب درندوں کا شور برپا ہو
تب خطرناک ہونا پڑتا ہے

یوں ہی بنتا ہے آفتاب کہاں
مثلِ افلاک ہونا پڑتا ہے

غزل

زندگی کیا ہے بس اِک رُوداد کی رُوداد ہے
ہو رہی ہے جو بسر اِک یاد کی رُوداد ہے

یہ جو ویرانی سی پھیلے جا رہی ہے ہر طرف
سُن سکو تو قریۂ آباد کی رُوداد ہے

اِس فسانے کی بُنت میں فیصلے کی جا نہیں
دِل دھڑکنا لذتِ فریاد کی رُوداد ہے

ہو چکا تعمیر اَزل کا خانۂ برباد دل
جاری و ساری ہے جو بنیاد کی رُوداد ہے

منتخب اب کیا کریں جب ہوں مقابل صِدق و صِدق
سنتے جاتے ہیں جو یہ اضداد کی رُوداد ہے

بے شباہت تھے پئے تقلید کیا چلتے سحرؔ
آپ بیتی عاشقِ آزاد کی رُوداد ہے

حسنین سحرؔ

غزل

خدا نہ کردہ کہ ابر و ہوا میں ٹھن جائے
زمیں زمیں نہ رہے ، ریگ زار بن جائے

اسے تو چودہ طبق سے گزرنا ہوتا ہے
کرن کے ساتھ کہاں تک کوئی بدن جائے

اب ایک رُت پہ ثمر آئے اور موسم کا
اور اک چمن کی مہک دوسرے چمن جائے

میں چٹکیوں میں اُڑاؤں گا پھر سفوف اس کا
ذرا یہ گاڑھی اُداسی قلم سے چھن جائے

یونہی مہکتی فضاؤں میں سانس لیتا رہوں
ہواؤں سے نہ تری بوئے پیرہن جائے

یہ پیڑ بیج تھا ، یہ بحر بوند تھا شاہد
یہ لمحہ پھیل کے ، ممکن ہے، عہد بن جائے

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کسی کے حسن کا انکار کفر ہے خالد
سوا اپنے عشق کا انکار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

ہزاروں لوگ ملتے ہیں کوئی تم سا نہیں ملتا
کہیں سیرت نہیں ملتی، کہیں چہرہ نہیں ملتا

مکمل ہوں، بہت خوش ہوں کہ اب اس دل میں جھانکوں تو
تمھارے بِن کہیں کوئی بھی نظارہ نہیں ملتا

تمھارے وصل نے کتنا مکمل کر دیا مجھ کو
رہِ دنیا میں کوسوں تک پتا اپنا نہیں ملتا

زمانہ ٹھیک سے سمجھا نہیں کارِ محبت کو
محبت میں جو سچے ہیں انھیں کیا کیا نہیں ملتا

تمہارے سامنے جو لوگ اپنے دھیان میں گم ہیں
رہِ الفت میں کوئی اس قدر کھویا نہیں ملتا

کسی پیمانِ الفت کو کبھی آسان مت لینا
محبت ترک کرنے پر کہیں یارا نہیں ملتا

بشیر احمد حبیب

انتخاب

رگ رگ رچ رچ اُتری خالد کس تن کی مہکار
کس کی راجائی میں اترے، کس کے باج گزار

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

فطرت میں جدا زہر زمانے سے ملا ہے
اک سانپ مجھے ایسا خزانے سے ملا ہے

منزل کے نشاں آبلہ پائی سے کھلے ہیں
چھاؤں کا پتا دھوپ میں آنے سے ملا ہے

جینے کے سبب جتنے ہیں، سامان ہے جتنا
سب احمدِ مرسلؐ کے گھرانے سے ملا ہے

دنیا کے کسی در سے میسر نہیں آیا
جو فیض مجھے شعر کمانے سے ملا ہے

برسوں سے جسے ڈھونڈ رہا تھا میں وہ چہرہ
مجھ کو تری تصویر بنانے سے ملا ہے

قدموں میں مرے پھینک دی تلوار جہاں نے
جب میرا نشانہ بھی نشانے سے ملا ہے

آئی نہ کسی کام کبھی میری سماجت
وہ شخص مجھے سر کو اٹھانے سے ملا ہے

وسیم عباس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عجیب، ہنر سے

غزل

چشمِ پُر آب میں اتنی نہ روانی آئے
جس سے باہر مرے اندر کی کہانی آئے

یوں مہکتے ہیں بہاروں میں ترے ہجر کے زخم
جیسے ساون میں گھٹاؤں پہ جوانی آئے

رونا روؤں میں بُرے وقت کا خشک آنکھوں سے
ہونٹ لرزیں نہ کبھی آنکھ میں پانی آئے

مڑ کے دیکھو گے تو برداشت نہ ہو گا مجھ سے
ایسے جاؤ کہ طبیعت میں روانی آئے

آؤ دیکھیں تو سہی کر کے تمنا اُس کی
شاید اب لوٹ کے وہ خواب کی رانی آئے

اس نے دیکھا ہے مجھے غور سے بعد از موسم
آج یاد اس کو بھی ایامِ جوانی آئے

یاد آتے ہیں ترے ساتھ وہ گزرے لمحے
جب کوئی سامنے تحریر پُرانی آئے

سننا پڑتا ہے محبت میں سبھی کچھ فرحانؔ
تیرے چہرے پہ نہ غصے کی نشانی آئے

سرور فرحان

غزلیں

ذرا سی آنچ بڑھا، دل جلا، یقیں رکھ دے
جہاں ہے عشق وہاں روحِ آتشیں رکھ دے

تو جانتی ہے کہاں ہے ترا خیالِ وجود
انا بچھا دے وہیں پر وہیں جبیں رکھ دے

ارادہ باندھ سفر کا یقیں کی چادر میں
دو ایک خواب کسی تہ میں بھی کہیں رکھ دے

زمیں کی چیز ہیں سب احتیاج کی باتیں
ترا سفر ہے جدا زادِ رہ یہیں رکھ دے

قدم قدم پہ سرائے ملے گی رکنا نہیں
شبِ وصال کی حسرت دلِ حزیں رکھ دے

یہ آسمان شناسا ہے میرا صدیوں سے
تجھے لپیٹ کے رکھنی ہے تو زمیں رکھ دے

شازیہ اکبر

اِدھر تھے ہم تو اُدھر تم تھے، درمیان گلاب
سنا رہے تھے کہانی وہ خوش بیان گلاب

گزر رہی تھیں بہاریں اسی کے سائے سے
بنا ہوا تھا سرِ باغ ، سائبان، گلاب

زیادہ دور نہ جاتے کبھی کناروں سے
وہ تیرتے ہوئے لہروں کی آن بان، گلاب

ہمارے ساتھ مہکتی ہوا ہے اب بھی گواہ
تری مہک کے ابھی تک ہیں ترجمان گلاب

خزاں کے دن ہیں تو کچھ اور یاد آتے ہیں
گزرنے والے وہ موسم، وہ بے نشان گلاب

سبھی کو دیکھنا پڑتا ہے شازیہ اکبر
وہ ایک روز کہ برسائے آسمان ، گلاب

غزلیں

ایسا بھی کیا گلہ کہ وہ ڈھب سے نہیں مِلے
شاید کہ ہم ہی دل کی طلب سے نہیں مِلے

مِل کر جدا ہوئے ابھی لمحہ نہیں ہوا
اور ایسا لگ رہا ہے کہ کب سے نہیں مِلے

آنکھوں نے اِک نظر میں ترا حُسن پی لیا
لب دیکھتے ہی رہ گئے لب سے نہیں مِلے

کچھ دوستوں سے تیری وجہ سے ہے دوستی
کچھ لوگ جن سے تیرے سبب سے نہیں مِلے

مِلنا تھا ہم نے جس سے اُسے مِل لیا امر
لوگوں کا اعتراض کہ سب سے نہیں مِلے

امر مہکی

اناؤنسر نے کہا ، انتظار ختم ہوا
سفر شروع ہوا ، انتظار ختم ہوا

شدید حبس میں گھٹنے لگا تھا میرا دم
مہکتا جھونکا چلا ، انتظار ختم ہوا

سُراغ جس کا کہیں مِل نہیں رہا تھا مجھے
مِلا ہے اُس کا پتا ، انتظار ختم ہوا

اِک اجنبی نے سرِ راہ مسکراہٹ دی
مجھے تب ایسا لگا ، انتظار ختم ہوا

میں اُس گلی میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا
پھر اِک دریچہ کُھلا ، انتظار ختم ہوا

میں اِک زمانے سے جس پل کا منتظر تھا امر
وہ لمحہ آ ہی گیا ، انتظار ختم ہوا

غزل

مرحلہ شوق کا دشوار بھی آسان بھی تھا
پیار ہی پیار، کہیں جنگ کا میدان بھی تھا

کوہساروں پہ کہیں برف رتوں کے موسم!
کہیں سورج کے نکل آنے کا امکان بھی تھا

روشنی تا بفلک ، آنکھ میں جلتا منظر
صبح میں شام کے آ جانے کا اعلان بھی تھا

کھڑکیاں کھول کے بیٹھا کہیں سہا سایہ
بند کمرے میں لگا دھوپ کا سامان بھی تھا

تیرے بعد آیا میں اک بار ترے گاؤں میں
راستہ اب کہ ترے گاؤں کا ویران بھی تھا

پھر وہی راہ وہ مانوس سی پیڑوں کی قطار
ڈھونڈتا ہوں کوئی مانوس سا انسان بھی تھا

یاد کی تہہ میں چھپی بات پہ رویا ہوں ندیم
جا چکا وہ جسے پا لینے کا ارمان بھی تھا

ندیم عباس اشرف

غزلیں

دھک دھک دھک دھک تھی آواز
دل نے تجھ کو دی آواز

کانوں میں رس گھولتی ہے
تیری کوئل سی آواز

ہونٹوں کی چُپ ٹوٹ گئی
آنکھوں نے جب دی آواز

تبدیلی اب آنے دو
ہے یہ خلقت کی آواز

پہلے بھی تو گونجی تھی
بالکل ایسی ہی آواز

مجھ کو میرا وہم لگا
اس نے بھی سن لی آواز

اک دن گُم ہو جائے گی
ارشد تیری بھی آواز

ارشد محمود ارشد

کچا پھل تھا اونچی شاخ
کیسے ہاتھ میں آتی شاخ

آخر ایندھن بنتی ہے
بوڑھے پیڑ کی سوکھی شاخ

جب صیاد نے وار کیا
دونوں تڑپے پنچھی ، شاخ

پتے شور مچاتے ہیں
کس گلچیں نے پکڑی شاخ

کلیاں کھلنے والی تھیں
بے دردی نے کاٹی شاخ

اس کے ہاتھ کا لمس ملا
سوکھے پیڑ سے پھوٹی شاخ

اُس بن جیون ایسے ہے
ارشد جیسے ٹوٹی شاخ

غزلیں

سب سے آواز ملاتا ہوا میں
خود سے جھگڑے کو بڑھاتا ہوا میں
گھیر کر لاتا ہوا لوگوں کو
اور پھر دور بھگاتا ہوا میں
نبض رکنے کا نہیں سوچتا ہوں
کوئی طوفان اٹھاتا ہوا میں
امنِ عالم کی دہائی دیتا
تیر پر تیر چلاتا ہوا میں
کتنا منہ زور نظر آتا ہوں
مال کمزور کا کھاتا ہوا میں

عدل کا خون کہیں کرتا ہوا
کہیں زنجیر ہلاتا ہوا میں
نظر آؤں کبھی وحشت کرتا
کبھی وحشی کو سدھاتا ہوا میں
اپنی سانسوں کو امر کرتا ہوا
ریت پر نقش بناتا ہوا میں
خود بھلا بیٹھا ہوں منزل جاذب
راستے سب کو بھاتا ہوا میں

اکرم جاذب

غرورِ حسن محبت پہ وارا جاتا ہے
اگر ہو جیتنا لازم تو ہارا جاتا ہے

تم اپنے منصب و دولت کا راگ الاپتے ہو
یہاں تو نام و نسب تک بسارا جاتا ہے

قریب ہے کہ خود اپنی شناخت کھو دو گے
جو روز روپ نیا ایک دھارا جاتا ہے

کمان کھینچ چلا تیر اور سب کو دکھا
کہ جو بھی ہاتھ نہ آئے وہ مارا جاتا ہے

بھلے فریب سبھی کھائیں نا خدائی کا
کہاں کسی کو مگر پار اتارا جاتا ہے

یہ لوگ ظلم کی تاویل ڈھونڈ لیتے ہیں
نصیب جبر کو جاذب پکارا جاتا ہے

غزل

جنھیں یہ لوگ جگنو کہہ رہے ہیں
فلک سے ٹوٹ کر تارے گرے ہیں

تری آنکھوں سے خود کو دیکھنا ہے
مرے دل میں بھی کچھ منظر پڑے ہیں

کوئی منظر نہیں درکار اِن کو
غذا آنکھوں کی بس یہ رتجگے ہیں

تری باتیں مضامیں ہیں غزل کے
ترے عارض غزل کے قافیے ہیں

مری تاریک دنیا میں ابھی تک
ترے روشن دیے کے تذکرے ہیں

یہی لکھنا مرے کوچے کے بارے
کہیں پتھر کہیں پر آئنے ہیں

نکل کر آنکھ کے پنجروں سے اکثر
فصیلِ شب پہ منظر ناچتے ہیں

ابھی سے جانے کی تیاریاں ہیں
گھڑی پر تو ابھی بارہ بجے ہیں

اسد رضا سحر

غزلیں

کیا بتاؤں میں کہاں شام و سحر کرتا رہا
جیسے ممکن تھا ترے بعد سفر کرتا رہا

اس حویلی کی خموشی سے یہی لگتا ہے
کوئی گھٹ گھٹ کے یہاں عمر بسر کرتا رہا

کمسنی میری کہاں اور کہاں شعر و سخن
کام مشکل تھا مرے یار، مگر کرتا رہا

خوب کی اُس نے ہواؤں کی حمایت لیکن
میں بھی ظلمت میں چراغوں کو امر کرتا رہا

عین ممکن ہے کہ کھل جائیں بدن کی پرتیں
ہجر سینے میں یونہی شور اگر کرتا رہا

اُس نے سیکھا ہے پرندوں سے تکلم کا ہنر
رات بھر بات، مرے ساتھ، شجر کرتا رہا

ارسلان ساحل

میرے چہرے پہ جو اداسی ہے
ایک جاں سوز بدحواسی ہے

میں قلندر دیارِ طیبہ کا
تو کہ! پارس کی دیوداسی ہے

تیرے بن ہیں یہ بام و در خاموش
اور اداسی بھی اچھی خاصی ہے

میں شبِ ہجر کس طرح کاٹوں؟
دیکھ! سگریٹ بھی اب ذرا سی ہے

تم بھی وعدہ خلاف ہو یعنی
یہ محبت بھی اب سیاسی ہے

غزل

ہم ایک فرد کی ہستی کے اعتبار میں ہیں
نگاہِ دہر سے پنہاں نگاہِ یار میں ہیں

ہمارے جسم پرانے ہوئے ہیں غربت سے
ہمارے نقش بھی بکھرے ہوئے غبار میں ہیں

کہاں کی عید کہاں آرزوئے جشنِ طرب
ہم اہلِ درد محرم کے انتظار میں ہیں

بصارتوں سے جو محروم ہیں زمانے میں
اسیر اُن کی حراست میں ہیں حصار میں ہیں

ہمیں نہ ڈھونڈ خیالوں کی بستیوں میں کہیں
کہ تیرہ بخت فروکش ترے دیار میں ہیں

حبیب و جون کے ہمراہ اپنے خیمے میں
حسین بیٹھے ہوئے حر کے انتظار میں ہیں

ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے جانِ اسدؔ
اداس تیرے لیے ہم تو اس بہار میں ہیں

اسد اعوان

غزل

مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے
کہ میرا عشق لا فانی نہیں ہے

ابھی تو اپنی نیندیں سو رہا ہے
ابھی تیرا کوئی ثانی نہیں ہے

وہ ٹھکرا دے کہ اب در سے اٹھا دے
ہمیں بھی شوقِ دربانی نہیں ہے

خدا جانے کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں
پلٹ جانے میں آسانی نہیں ہے

یہ بستی ڈوبنے والی ہے شاید
کسی کی آنکھ میں پانی نہیں ہے

یہ کیسا دشت ہے دشتِ محبت
یہاں سب کچھ ہے ویرانی نہیں ہے

مکمل ہے یہ خود میں یوں بھی عاصمؔ
محبت مصرعۂ ثانی نہیں ہے

عاصم اعجاز

غزل

ابھی تلک تو بڑی ماند تھی چراغ کی لو
چراغ بجھنے لگا تو بڑھی چراغ کی لو

ذرا سا ہاتھ بڑھایا تھا میں نے اسکی طرف
تو ڈر کے تھوڑا سا پیچھے ہٹی چراغ کی لو

تمام رات وہ مجھ سے نظر چراتی رہی
کسی کی آنکھ سی لگتی رہی چراغ کی لو

یہی بہت ہے کہ تنہا کبھی نہ ہونے دیا
شبِ فراق، مرے ساتھ تھی چراغ کی لو

نجانے کس کی نظر کھا گئی اسے طاہرؔ
وگرنہ رقص کیا کرتی تھی چراغ کی لو

رانا سرفراز طاہرؔ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیتِ دیوانِ غزل تھا خالد
یاد مجھ کو بھی تھا ، پر بھول گیا

غزلیں

اس سے پہلے کہ غم ہوا ہو جائے
اک نیا زخم پھر عطا ہو جائے

اپنے اندر کہیں میں سو جاؤں
ار تری یاد اک ردا ہو جائے

دیکھ لے وہ کبھی محبت سے
دل کا موسم کبھی ہرا ہو جائے

مجھ سے مل لے وہ ایک بار تو پھر
عمر بھر کے لیے جُدا ہو جائے

اس سے کہنی ہے دل کی بات ضرور
جس قدر مجھ سے وہ خفا ہو جائے

یہ بھی ممکن ہے اس محبت میں
آدمی بھی یہاں خدا ہو جائے

جاوید صدیق بھٹی

صحرا صحرا دھوپ ہوئی اور سر پہ سایہ کوئی نہیں
عمر گزاری راہ گزر میں لیکن آیا کوئی نہیں

چلتے چلتے ہم نے یار و غم کا دامن تھام لیا
برکھا آئی، آنسو برسے، بادل چھایا کوئی نہیں

اس گہرے سناٹے میں تو اپنی بھی آواز نہیں
کہنے کو ہے محفل روشن، لیکن آیا کوئی نہیں

گرتے گرتے گر جائیں گے میرے دل کے شیش محل
عشق سمندر اتنا گہرا، روگ لگایا کوئی نہیں

کالی راتیں ناگن بن کر دل کو ڈستی جاتی ہیں
ہجر کے موسم میں جاوید کا اپنا پرایا کوئی نہیں

غزل

درد تحریر کر نہیں سکتا
غم کو تصویر کر نہیں سکتا

گزرے پل پل کا ذکر کر کے میں
خود کو دل گیر کر نہیں سکتا

ربط ٹوٹا ہوا ہے برسوں سے
اس کی تشہیر کر نہیں سکتا

بے ضمیروں سے ہے مجھے نفرت
اُن کی توقیر کر نہیں سکتا

ایک سپنا تھا ساتھ جینے کا
خواب ، تعبیر کر نہیں سکتا

اُن کی کوشش ہے چھوڑ جانے کی
میں بھی تدبیر کر نہیں سکتا

میری قسمت میں درد ہیں حیدرؔ
ختم تقدیر کر نہیں سکتا

حمید حیدر اعوان

غزل

کبھی لَو بڑھی تری یاد سے، کبھی خط پکڑ کے جلا دیا
کبھی شِدّتِ غمِ ہجر سے ترا نام لکھ کے مٹا دیا

مرے مُرشدی ترے بعد دل کسی اور کا نہیں ہو سکا
کہ پُجاریوں میں یہ ریت ہے جو چڑھا دیا سو چڑھا دیا

مری خاک کو نہیں چاہ اب، رہی دوسرے کسی چاک کی
مرے کوزہ گر ترے ہاتھ نے جو بنا دیا سو بنا دیا

دلِ سوختہ کا وہ داغ ہو یا وہ منتوں کا چراغ ہو
ترے نام پر ترے بام پر جو جلا دیا سو جلا دیا

یہاں تشنگی رہے جب تلک نہیں پھیرتے ہیں نگاہ کو
یہاں ساقیوں میں رواج ہے جو بڑھا دیا سو بڑھا دیا

نہ وہ حدتوں بھرا ہاتھ ہے، نہ وہ شعلگی بھرا ساتھ ہے
ابھی مختصر یہی بات ہے جو بُجھا دیا سو بُجھا دیا

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہڈیوں تک جھلس گئے خالد
آنکھ نے لَو چراغ کی چکھ لی

غزلیں

پھر یہ کون و مکان بولیں گے
جب یہاں بے زبان بولیں گے

میرے منہ میں زباں رہے نہ رہے
آنکھ کے اشک دان بولیں گے

دھوپ کب تک جلائے گی یارو
صبر کے سائبان بولیں گے

منزلیں سادھ لیں گی چپ لیکن
راستے بے تکان بولیں گے

بن کے گونگے کھڑے رہے افسر
ہم کو جن پر تھا مان بولیں گے

افسر رشید افسر

پھر کسی نے وہ کہاں شاداب دیکھے
پھولوں نے جب تتلیوں کے خواب دیکھے

جن کی لہریں اپنی جاں میں گم گئی تھیں
ہم نے دریا ایسے بھی پایاب دیکھے

اس وجہ سے ہم نے آنکھیں موند لی ہیں
کس کو فرصت اِن میں ڈوبے، آب دیکھے

کرگسوں کو تھی میسر بادشاہی
جھونپڑی میں پلتے یاں سرخاب دیکھے

وہ نہیں ہوں جو زمانہ کہہ رہا ہے
مجھ کو دیکھے، پھر وہ سب، القاب دیکھے

رات سوتی ہے سکوں سے اِس نگر میں
شمس ہم کو کون اب بے خواب دیکھے

آفتاب محمود شمس

غزل

رخسانہ سمن

وہ جو خوابوں کے سلسلے تھے میاں
کیسے بن کر بکھر گئے تھے میاں

تم خریدار ہی نہ تھے ورنہ
ہم تو بے دام بک رہے تھے میاں

راستے خود بخود بدلتے رہے
اور ہم تم سے آ ملے تھے میاں

اذنِ قربت میں کتنی دیر ہوئی
ہم تو صدیوں سے جا چکے تھے میاں

قافلہ دل کا لٹ گیا تھا وہیں
جب نگہبان تم ہوئے تھے میاں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزلیں

تیری قربت کی جستجو کی ہے
کیا عجب دل نے آرزو کی ہے

بات جو بھی تھی روبرو کی ہے
کب پسِ پشت گفتگو کی ہے

میں نے خود کو اگر نہیں بدلا
ترک کب تو نے اپنی خو کی ہے

سوچ تیری جدا ہے گر مجھ سے
کیوں پھر اتنی بھی گفتگو کی ہے

زندگی جی کے تھک چکے ہیں ہم
موت کی اب تو آرزو کی ہے

عرش کو چھو کے کیوں نہیں آتی
"جب دعا کی ہے باوضو کی ہے"

بھول جانا تری ضرورت تھی
پوری تیری ہی آرزو کی ہے

تو نے کب مجھ سے بیوفائی کی
بات ساری تو اس لہو کی ہے

کچھ بھی تو زندگانی میں ویسا نہیں رہا
تھا مان جس پہ اب وہی رشتہ نہیں رہا

خوابوں نے نیند میں کئی رستے بنا لئے
دل تک جو جا سکے وہی رستہ نہیں رہا

معدوم کر دیا ہے سبھی کچھ تو وقت نے
افسوس کوئی نقش گزشتہ نہیں رہا

ہر کوئی مجھ سے نالاں تو ہر شخص ہے خفا
ہمدرد اب تو کوئی بھی میرا نہیں رہا

رکھتا ہے بغض دل میں وہ یہ جانتی ہوں میں
پہلے سا مجھ سے گرچہ کبیدہ نہیں رہا

آئے گا لوٹ کر نہ پکاریں گے ہم اسے
سب کچھ رہا وہیں ترا وعدہ نہیں رہا

نائیلہ راٹھور

غزل

پہلے پہلے پیار کا موسم تھا جذبات نشیلے تھے
ہم تھے، تم تھے، برکھارت تھی، شام کے ہونٹ رسیلے تھے

نیلی جھیلیں مجھ کو اپنی جانب کھینچتی رہتی تھیں
اُس کی نیلی آنکھیں تھیں اور سات سمندر نیلے تھے

مہندی والے ہاتھ تھے پیلے، زرد کسی کا چہرہ تھا
موسم بدلا تھا شاخوں پر پتے سارے پیلے تھے

ایک محبت جان کی بازی ہار گئی اُس رستے میں
اُس بستی کے سب لوگوں کے دل کتنے پتھریلے تھے

شہر ملمع کاروں کا تھا، ظاہر باطن ایک نہ تھا
دل میں کتنی کالک تھی چہرے لیکن چمکیلے تھے

جیسے وقت بدل جاتا ہے ہم بھی بدلے بدلے ہیں
جاناں! کچھ دن پہلے تک ہم بانکے اور سجیلے تھے

سارے مصاحب بھانڈ بنے تھے روز تماشا ہوتا تھا
اُس دربار میں حاضری دینے والے سب رنگیلے تھے

اک طوفانی بارش میں جبران ملے تھے ہم دونوں
من کے اندر شعلہ تھا اور تن پر کپڑے گیلے تھے

وسیم جبران

غزلیں

چڑا رہا ہے مرے منہ کو سنگ میل سفر
مجھے نہ سونپ پڑاؤ پہ اتنی ڈھیل سفر

وہ خوش نصیب ہیں منزل پہ جو پہنچتے ہیں
ہماری روح میں کاڑھے گئے ہیں نیل سفر

'بہشت سے نہ کہیں اور انتقال کریں'
پکارتا ہے شہیدوں کو سلسبیل سفر

صعوبتوں کی ہتھوڑی نے تنگ گیری سے
ہمارے پاؤں میں ٹھونکی ہے ٹیڑھی کیل سفر

"چپک گیا ہے مرے جسم کی مسافت سے"
غبارِ زیست مری روح سے نہ چھیل سفر

مہک رہا ہے تری یاد کا گلاب ایسا
پڑا ہو جیسے کہ عارضؔ پہ زنجبیل سفر

سرفراز عارض

گُل کو لائے صبا کی رتھ پر کون
باغ میں جائے اس سَکَت پر کون

رابطے تیز ہو گئے اتنے
ننگے پاؤں اب آئے چھت پر کون

میں نے اسلام کو قبول کیا
لائے ایمان من گھڑت پر کون

ہم سے کہتے ہیں زیور دل کو
رکھّے گروی لکھت پڑھت پر کون

گُل سے عارضؔ کو چُوم کر چھوڑا
کان دھرتا لبوں کی مت پر کون

غزل

کون ، جانے حصار مٹی کا
آسماں ہے غبار مٹی کا

کوئی دنیا نکال مٹی سے
کوئی پردہ اتار مٹی کا

آگ جلتی ہے راکھ ہوتی ہے
کون سہتا ہے وار مٹی کا

پانیوں کا وجود مٹی سے
آگ میں ہے شرار مٹی کا

صرف مٹی کی آبرو کے لیے
بن رہا ہے مزار مٹی کا

کاروبارِ حیات پوچھتے ہو!
چل رہا ہے اُدھار مٹی کا

اور مٹی کی کیا فضیلت ہو
میں بھی مٹی کا یار مٹی کا

آپ جس کو پہاڑ کہتے ہیں
ہے ذرا سا اُبھار مٹی کا

ماں کا قرضہ اتارنا ہے تجھے؟
پہلے قرضہ اتار مٹی کا

امتیاز انجم

غزلیں

وہ کم کرنے لگی ہے رابطہ آہستہ آہستہ
کوئی لے ہی نہ لے میری جگہ آہستہ آہستہ

زیادہ دیر تک نقشِ کفِ پا چومتا اُس کے
اگر صحراؤں میں چلتی ہوا آہستہ آہستہ

کسی کا بھی ہو دکھ یکدم سنا جاتا نہیں مجھ سے
جو بیتی ہے ترے دل پر سنا آہستہ آہستہ

محبت میں کسی کی یاد کا زندان ایسا ہے
جہاں بڑھتی ہے قیدی کی سزا آہستہ آہستہ

مجھے وقتاً فوقتاً خود کو چھونے کی اجازت دے
میں ہونا چاہتا ہوں پھر ہرا آہستہ آہستہ

زباں میں صرف لکنت ہی نہیں دل میں ادب بھی تھا
سو تیرا نام محفل میں لیا آہستہ آہستہ

نیا قانون لانے سے اگر سمجھو تو بہتر ہے
پرانے کو کیا جائے نیا آہستہ آہستہ

ازور شیرازی

زمانہ یار کی فرقت کا بہتر آنے والا ہے
کہ مجھ میں حوصلہ غم کے برابر آنے والا ہے

ذرا سی ریت کیا اُڑتی نظر آئی کہ لوگوں کو
بتانے لگ گئے فوراً مرا گھر آنے والا ہے

رُکو! حملہ نہیں کرنا ابھی اعدا کے لشکر سے
ہمارا خاص کارندہ نکل کر آنے والا ہے

زیادہ دیر تک تجھ سے تعلق رکھ نہیں سکتا
تُو لوگوں کو بڑی جلدی مُیسر آنے والا ہے

ہماری آنکھ کی بنجر زمیں سیراب کرنے کو
جو دریا درد کا دل میں تھا اوپر آنے والا ہے

ہمارے دل تک آنے کا جسے معلوم تھا رستہ
وہی دُنیا کے دروازے سے اندر آنے والا ہے

ہوا نے ریگِ صحرا سے کہا لطف و کرم رکھنا
تمہارے خشک دامن میں گلِ تر آنے والا ہے

غزلیں

سانس کی طرح تو ضروری ہے
اور پھر چارسو ضروری ہے

کونجیں اُتریں گی اور بولیں گی
دشت میں آب جُو ضروری ہے

خاموشی پیار مر بھی جاتا ہے
اس لیے ہاؤ ہو ضروری ہے

عشق نام و نسب نہیں جچتا
اس لیے اللہ ہو ضروری ہے

جب مقابل ہو کوہِ طور تو پھر
دل سا انگار خو ضروری ہے

تجھ سے ملنا کوئی ضروری نہیں
بس تری جستجو ضروری ہے

اعجاز رضوی

دمِ آخر یہ سلطانی بنی ہے
بڑی مشکل سے آسانی بنی ہے

پرندے جا بسے جغرافیے میں
ڈرائنگ بک پہ ویرانی بنی ہے

کہیں صحرا کہیں دریا بنے ہیں
کہیں پر رات کی رانی بنی ہے

میں سمجھا تھا پکارے گی مجھے بھی
مگر دنیا تو انجانی بنی ہے

بظاہر اک پہاڑی سامنے تھی
لگایا ہاتھ تو پانی بنی ہے

ہندوستانی غزل نامے کا روشن دستخط

شاعرِ امروز
سالم سلیم

شاہد ماکلی

سالم سلیم کی غزل میں ایک حزنیہ زیریں لہر اپنی پوری گمبھیرتا کے ساتھ جاری و ساری رہتی ہے۔ اس حزنیہ لہر کا محسوساتی آہنگ ہماری کیفیات کو نامعلوم سٹرنگز کے تسلسل سے جوڑ دیتا ہے ۔ آہنگ کی اثر پذیری ہمارے وجدان کو ایک ایسی کوہستانی تمثیل کے اسرار میں لے جاتی ہے جہاں کی راتیں جوں جوں گہری ہوتی جاتی ہیں، بہتے ہوئے چشموں کی مترنم آوازیں ہماری روح کے تاروں سے اتنی ہی ہم آہنگ ہوتی جاتی ہیں۔ روحانی کیف کا وفور ہمارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اسی کیفیاتی دورانیے میں ہم پر ایک دم اُس حزنیہ لہر کے معنی منکشف ہوتے ہیں جو سالم سلیم کی غزل میں اوّل تا آخر جاری و ساری ہے۔ اس حزنیہ لہر کا لطیف احساس نہ صرف وجد آور ہے بلکہ مکاشفاتی اظہاریے کی اساس بھی ہے۔ اس مکاشفاتی لمحے کو سالم سلیم جیسا تخلیق کار اپنے تخلیقی تصرف میں لے آیا ہے۔ ان کے روحانی تجربات کی کئی منزلیں ہیں۔ ایک منزل ایسی ہے جس کے دائرہء کار میں پھیلا ہوا تمام عالم ایک طلسمِ خیال لگنے لگتا ہے؛ شہود پر مجاز اور وجود پر واہمے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

سالم سلیم کی پیدائش اتر پردیش کے مردم خیز شہر اعظم گڑھ میں 1985 میں ہوئی۔ جون ایلیا کے فن اور شخصیت پر مقالہ لکھ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ سلیم احمد کے شعری سروکار پر دلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ 2002 سے شعر کہنا آغاز کیا۔ 2017 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ اردو میں "واہمہ وجود کا" اور ہندی رسم الخط میں " سبھی رنگ تمھارے نکلے " کے نام سے ریختہ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔

پچھلے دس برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں اور ریختہ فاؤنڈیشن سے وابستہ ہیں۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

میری مٹی میں کوئی آگ سی لگ جاتی ہے
جو بھڑکتی ہے ترے چھڑکے ہوئے پانی سے

یہ میں نہیں، مری پرچھائیں ہے ترے آگے
کہ اپنا آپ تو میں گھر پہ رکھ کے آیا ہوں

اک ہاتھ میں ہے آئینہ ذات و کائنات
اک ہاتھ میں لیے ہوئے پتھر کھڑا ہوں میں

یہ تم نہیں ہو، کوئی دھند ہے سرابوں کی
یہ ہم نہیں ہیں، کوئی واہمہ وجود کا ہے

کوئی ہنگامہ کریں صبح کے آ جانے تک
رات کٹنے کی نہیں قصہ طولانی سے

تری تلاش میں آخر یہ دن تمام ہوا
کٹے گی رات ترا انتظار کرتے ہوئے

عجب اک ربط ہے اس واقعے کا
کسی بھولی ہوئی اک داستاں سے

میں آپ اپنے اندھیروں میں بیٹھ جاتا ہوں
پھر اس کے بعد کوئی شے چمکتی رہتی ہے

کھینچے تھے کتنے رنج خود اپنی تلاش میں
اک روز اپنے آپ کو پا کر میں خوش ہوا

چیخ کے ٹوٹ گئی ہے تو بن گئی آواز
جو میرے سینے میں اک روز خامشی ہوئی تھی

یہ کیسی آگ ہے مجھ میں کہ ایک مدت سے
تماشا دیکھ رہا ہوں میں اپنے جلنے کا

میرے پھیلاؤ کو کچھ اور بھی وسعت دی جائے
اب مجھے خود سے نکلنے کی اجازت دی جائے

بے خد و خال سا اک چہرہ لیے پھرتا ہوں
چاہتا ہوں کہ مجھے شکل و شباہت دی جائے

گزر رہے ہیں سبھی روندتے ہوئے مجھ کو
تری گلی میں کوئی نقشِ پائمال ہوں میں

میں تھک کے بیٹھ گیا ہوں خود اپنے سائے میں
کہ تیرا دشتِ طلب بے کنار ہو گیا ہے

اپنے گھر سے کبھی نہیں نکلا
اور محوِ سفر رہا ہوں میں

کیوں نہ ہم یاد ہی تجھے کر لیں
یونہی بیٹھے ہوئے خیال آیا

اپنے جیسی کوئی تصویر بنانی تھی مجھے
میرے اندر سے سبھی رنگ تمہارے نکلے

کچھ بھی نہیں ہے باقی، بازار چل رہا ہے
یہ کار و بار دنیا بیکار چل رہا ہے

اک آگ سی نظر آئی سر کنارہ شام
تو اک دھوئیں نے بہت مجھ میں پیچ و تاب کیا

یہ رات صبح میں تبدیل ہونے والی ہے
سب اپنی اپنی کہانی کا اختتام کریں

☆☆☆☆☆

غزل کے منہ کا بدلنا تھا ذائقہ مجھ کو

شاعرِ امروز

حسن ظہیر راجہ

شاہد ماکلی

حسن ظہیر راجہ کی تخلیقی صلاحیت درجہ بہ درجہ ارتقا پذیری کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ وہ دوسری دہائی میں سامنے آنے والے ایک عمدہ اور پُر امکان شاعر ہیں۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں نوجوان شعرا کی پہلی صف میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ معاصر سماجیات اور ادبیات کے جدید رجحانات اور روّیوں کو انھوں نے نہ صرف پوری طرح جذب کیا ہے بلکہ اس کی پیش کاری میں ایک ایسا اسلوب اپنایا ہے جو حسیاتی سطح پر زیادہ تازہ، توانا اور متاثر کُن ہے۔ بہت سے لوگوں کے ہاں جدید شاعری، تازگیٔ لفظ اور لسانی طلسم کاریوں سے مشروط ہے جو شاید ایک حد تک درست ہے مگر یہ دلفریبی زیادہ دُور اور دیر تک ساتھ نہیں دیتی۔ حسن ظہیر راجہ کا شعری سلسلہ صائب کے نظریۂ شعری سے انسلاک کی بِنا پر زیادہ کشادہ راستوں اور کُھلی فضاؤں کا سلسلہ ہے۔ معنیٔ بیگانہ کی تلاش ان کا بنیادی مدعا ہے۔ نئے معنی اور مضمون کی جستجو ہی انھیں آگے سے آگے رواں دواں رکھتی ہے۔ وہ اس ذہن اور سیّارگی میں نت نئے تخلیقی منطقوں تک رسائی پاتے ہیں۔ وہاں کی فضاؤں سے جمالیات کشید کرتے ہیں اور پھر وہاں سے کسی اگلے منطقے کو نکل پڑتے ہیں۔ یہ سیر ان کے ہاں انفُسی نوع کی بھی ہے اور آفاقی بھی؛ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ دونوں سطوح کے تجربات کی یکجائی نے ان کی غزل کے معنیاتی افق کو خاطر خواہ وسعت دی ہے۔

ظہیر حسن راجہ۔ 10 مارچ 1990 کو کہوٹہ میں پیدا ہوئے۔ 2013 سے باقاعدہ لکھنا آغاز کیا۔ نمل یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اردو کر رہے ہیں۔ ذیل میں ان کے منتخب اشعار:

تم کہیں سے بھی توڑ سکتے ہو
کوئی ترتیب ہی نہیں اپنی

جانے دریا کو مسئلہ کیا ہے
اب میں ناؤ سے بات بھی نہ کروں ؟

اصل میں اُس طرف بلندی تھی
جس طرف تُو گرا گیا تھا مجھے

تیرا ہنسنا بھی کیا مصیبت ہے
میں کوئی بات کرنے آیا تھا

تم نے خود سے کبھی یہ پوچھا ہے
میں نے کیوں دوسری محبت کی

تم اپنی آنکھوں کی خیر مانگو
وہ شخص خوابوں تک آ گیا ہے

کسے رہائی کی اب ضرورت
بہار پنجرے میں آ گئی ہے

ہمیں جلدی بچھڑنا پڑ گیا تھا
ہمارے پاس باتوں کی کمی تھی

جہاں کے آخری حصے میں ہوں اب
سفر نامہ مکمل ہو رہا ہے

گھومنے پر کوئی آئے تو
دنیا چھوٹی پڑ جاتی ہے

اب تو اس کی خاموشی بھی
مجھ کو لکھنی پڑ جاتی ہے

ہم محبت کے کنارے پہ پڑے رہتے تھے
سخت موسم ہمیں محسوس نہیں ہوتا تھا

اُس نے ماں باپ کا چپ چاپ کہا مان لیا
میں تو سمجھا تھا کہ پنکھے سے لٹک جائے گی

ہم مانتے ہیں تُو نے اُٹھائی نہیں کمان
لیکن یہ تیر تیری ہدایت سے آئے ہیں

اب آئنے کے آگے کھڑے سوچتے ہیں ہم
کچھ تجربے زیادہ ہی خود پر کیے گئے

میں اس پہ رو رہا تھا کہ آنکھیں چلیں گئیں
پھر یہ پتا چلا وہ نظارے بھی لے گیا

پہلے تو کشتیوں پہ کیا اُس نے ہاتھ صاف
دریا پھر اس کے بعد کنارے بھی لے گیا

میں چاہتا ہوں خود ہی سمجھ جائے میرا دکھ
میں چاہتا ہوں اس کو بتانا نہیں پڑے

پہلے ہی تیز رو تھیں زمانے کی گردشیں
اس پر کمال، میں بھی روانی میں آ گیا

ہمارے نام وہاں سے مٹا دیے گئے تھے
درخت کاٹ کے رستے بچھا دیے گئے تھے

تمھاری سال گرہ تک قفس کی رونق تھی
پھر اس کے بعد پرندے اُڑا دیے گئے تھے

ہمیں خبر نہ ہوئی کس طرف گئی دنیا
ہم ایک خواب کے پیچھے لگا دیے گئے تھے

ترے رویّے سے مشروط کر کے تبدیلی
عجیب طرز کے موسم بنا دیے گئے تھے

مری فضاؤں کو امن و امان چاہیے تھا
اِسی لیے تو پرندہ نشان میں نے لیا

مجھے تو اچھے برے کی تمیز تھی ہی نہیں
زمین چھوڑ دی اور آسمان میں نے لیا

ہم اپنے لہجے پہ یونہی توجہ دیتے رہے
ہماری آنکھ سے ظاہر ملال ہو گیا تھا

تمھارے چھوڑ کے جانے کا رنج اپنی جگہ
ہمارا رابطہ خود سے بحال ہو گیا تھا

مرا حساب ذرا مختلف ہے اوروں سے
میں احتیاط کروں تو مری بچت بھی نہ ہو

میں ایک بار اِدھر بھول کر چلا گیا تھا
پھر اس کے بعد مسلسل یہ بھول ہونے لگی

اب اپنے بیچ یہی خامشی ہی بہتر ہے
کہ گفتگو تو ہماری فضول ہونے لگی

پھر اُس کو آئنے کے سامنے میں لے آیا
کہ دیکھنا تھی اُسے شعری کائنات مری

میں اگلی بار کوئی انتظام کر لوں گا
جو سر پہ آئی ہوئی ہے اسے تو ٹال ابھی

سمے کے ساتھ بدلتی ہیں خواہشیں دل کی
کبھی جو غیر ضروری تھا اب ضروری ہے

دیواریں نیا رنگ طلب کرنے لگی ہیں
کیا لوگ تمھارے اِسی حالت میں رہیں گے

ہوتا تو نہیں ایسے مگر ہم نے کیا ہے
اک یاد مسلسل پہ لگاتار گزارا

اب ایک سا موسم تو ہمیشہ نہیں رہتا
ممکن ہے کسی روز اچانک کوئی آئے

غزل کے منہ کا بدلنا تھا ذائقہ مجھ کو
ذرا سا شہر سے ہٹ کر مکان میں نے لیا

☆☆☆☆☆

چپیڑ کی فضیلت [طنز و مزاح]

سیدہ آمنہ ریاض

ہم میں سے ہر خاص و عام نے چپیڑ عمر کے کسی حصے میں یا تو کھائی ہے یا پھر ماری ہے۔ چپیڑ کھانے والا اور مارنے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ مشہور کہاوت ہے کہ کسی کا منہ لال دیکھ کر اپنا منہ چپیڑوں سے لال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے لیے آج کل بہت سے بلش آنز مارکیٹ میں بآسانی دستیاب ہیں۔

چپیڑ کو پنجابی میں چنڈ کہتے ہیں۔ ویسے تو چپیڑ بھی پنجابی ہی کا لفظ ہے۔ لیکن اردو میں گھل مل سا گیا ہے۔ اب اس چپیڑ سے ہمیں کافی اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر بچپن میں کھائی گئی چپیڑیں بھلائے نہیں بھولتیں۔

چپیڑ کی کافی اقسام ہیں۔ جن میں چنڈ، مکا، گھسن بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ لیکن ان کا ہتھ چھٹ اور بگ ٹٹ استعمال جتنا پاکستان میں کیا جاتا ہے، اتنا کسی اور ملک میں نہیں کیا جاتا۔ ان اول الذکر آلات میں سے چپیڑ ہی با آسانی ماری جا سکتی ہے۔ البتہ چھڈ دیں چپیڑ کا سواد اچانک چھکا لگنے کے عین برابر ہے۔

چپیڑ نہ صرف ملک کے عوام کا بڑا ہتھیار ہے بلکہ اسے خواص بھی اپنانا پسند کرتے ہیں۔ خواتین سیاستدان تو اب مردوں کو جسمانی طور پر ہراساں کرنے کے لیے چپیڑ کا ہی سہارا لیتی

ہیں۔ایسی ہی ایک چھیڑ باجی فردوس عاشق اعوان نے مندوخیل کو جاوید چودھری کے پروگرام میں ماری تھی،وہ دراصل چھڈ دیں چھیڑ تھی۔جس کا نشہ مندوخیل کو کئی سال تک رہنے کی امید ہے۔

ایک مشہور زمانہ چھیڑ فرانس کے صدر کیمرون کو ڈیمین ٹیریل نامی شخص نے بھی ماری۔اس اچانک چھیڑ کا سواد پچاس ڈگری ٹمپریچر میں ٹھنڈا گلاس روح افزا پینے سے بھی زیادہ تھا۔۔۔کا کے نے ٹھنڈ پا تی۔۔۔۔سب سے زیادہ اس چھیڑ کا مزہ پاکستانی دیلی قوم نے لیا۔۔۔جو اپنی ذاتی بیگمات سے ایسی ہی چھیڑیں روز کھاتے ہیں۔

چھیڑیں مارنے کے کئی طریقے ہیں۔بجی مار کے بھی بتاتا،چکا دیں چھیڑ،ٹھسن کی چھیڑ اور ہتھ وکھی چھیڑ۔یہ سب چھیڑیں بہت ہی زیادہ فضیلت کی حامل ہیں۔اگر مخالف پہ آپ کی چرب زبانی کا جادو نہیں چل رہا،شوہر رن مرید نہیں بن رہا،بچے گھر میں دھما چوکڑی مچا رہے ہیں،محبوب قدموں میں نہیں گر رہا۔۔۔تو کسی عامل بنگالی باوا کے پاس جانے کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں۔ضرورت ہے تو بس ایک چھڈ دیں چھیڑ کی۔۔۔بس پھر ہر طرف راوی چین ہی چین لکھے گا۔شوہر چنگا پلا تھلے لگ کے رہے گا،مخالف آپ کے ایریا میں آنے کی جرات نہیں کرے گا،بچے اگلی چھیڑ تک شانتی کے نغمے گائیں گے اور محبوب وہ بھی آپ سے ڈر کے آپ ہی کا رہے گا۔

پاکستانی عوام تو لگتا ہے پیدا ہی چھیڑیں کھانے کے لیے ہوئی ہے۔مہنگائی،بجلی اور پیٹرول میں اضافے کی چھیڑیں ایسی چھیڑیں ہیں جو آئے دن ٹھاہ ٹھاہ اپنا جادو جگاتی ہی رہتی ہیں۔بلکہ ڈر ہے کہ اگر ہر مہینے بجٹ میں اضافے کی چھیڑ عوام کے بوتھے پہ نہ وجے تو وہ اپنا گریباں چاک کر کے سڑکوں پہ نکل آئیں گے۔کیونکہ کوئی نہ کوئی سیاپا تو زندگی میں رہنا ہی چاہیے۔

ویسے عوام میں اتنی پاپولر ہونے کے باوجود چھیڑ کا کوئی عالمی دن نہیں منایا جاتا۔یہ چھیڑ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ہاں بھئی مفت جو دستیاب ہے اور کسی قسم کا ٹیکس بھی نہیں دینا پڑتا۔

ہماری حکومت سے پرزور اپیل ہے کہ چھیڑ کا عالمی دن منایا جائے۔لیکن اگر یہ اپیل مان لی گئی تو سب سے زیادہ اس دن کا فائدہ میاں بیوی اٹھائیں گے بلکہ شدت سے اس دن کا انتظار کریں گے۔کیونکہ اس دن ان سے کوئی بازپرس نہیں کی جائے گی،عام معافی کا اعلان ہوگا اور نہ کوئی پرچہ کٹے گا۔

نوٹ:حکومت سے ایک اور اپیل ہے کہ باقی پیش کی گئی ہزاروں اپیلوں کی طرح اس اپیل پر بھی نظر ثانی نہ کرے۔۔۔ورنہ خدشہ ہے کہ اس دن میاں بیوی ایک دوسرے کو چھیڑیں مار مار کے توں کر دیں گے۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

خوفیات (طنز و مزاح)

بڑا تعجب ہوتا ہے ہمیں جب کسی کو اپنی بہادری کے قصے بیان کرتے سنتے ہیں - اسی طرح فلموں اور تاریخ کی کتابوں میں ہیرو کے کارنامے دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں - جانے کیسے کیسے جی دار لوگ جی رہے ہیں جگ میں - شائد ہم بہت ہی کمزور دل کے مالک ہوں یا ہوسکتا ہے بہادری کے جراثیم ہمارے قریب سے بھی نہ گزرے ہوں - ڈرامے یا فلم میں کوئی دردناک سین دیکھتے ہیں تو خود بخود آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگتے ہیں - تیز چیخ سنتے ہیں یا کوئی ڈراونا سا منظر دیکھتے ہیں تو کانپ اٹھتے ہیں؛ پتہ نہیں کیوں ----!!! ممکن ہے خوف کے جراثیم موروثی طور پر ہمارے خمیر میں گندھے ہوئے ہوں اور یا شائد ماحول اور معاشرے نے ہمارے ذہن و خیال کے ساتھ خوف کی جونکیں چمٹا کر ہم پہ کوئی احسان کیا ہو!!!----

بچپن میں والدین اور گھر والوں نے ہمیں خوفزدہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی - شروع شروع میں وہ ہمیں مار کے ڈراتے تھے - چھڑی، چھانٹے اور چپل کے اوزار بطور ہتھیار آزادانہ استعمال کر کے ہماری ہمت و حوصلے کو آزمایا جاتا تھا - جب ہم اس کے عادی ہوگئے اور مارنے کا خوف اپنی اہمیت کھو بیٹھا تو خوفناک اشیاء سانپ، بچھو، اژدہے اور بد روح چڑیلوں سے ڈرانے لگے - جن بھوت کا خوف بھی بڑی مقدار میں ہمارے معصوم ذہن میں داخل کیا گیا - صفر کے مقدس اسلامی مہینے کو ان نیک بختوں نے ایک انتہائی ڈراؤنی کبرسن چڑیل سے منسوب کر دیا تھا - کہتے تھے یہ بدروح چڑیل کا مہینہ ہے اس لئے رات کو نکلتے وقت احتیاط کریں - ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ بچپن میں ہمیں یہ مہینہ جب بھی ملا، سردیوں ہی میں ملا؛ جب سخت سردی کے باعث لوگ سرشام ہی سے کمروں میں دبک جاتے تھے - عشاء کے فوراً" بعد کمرے کے دروازے بند کر کے روشنیاں گل کر دی جاتی تھیں اور اسی وقت دادی یا والدہ ہمیں سلانے کے لئے بوڑھی

نور کمال شاہ

چڑیل کا قصہ چھیڑ دیتی تھیں- چڑیل رات گہری ہوتے ہی آبادیوں میں داخل ہوتی تھی اور اس کے ہاتھ میں روشنی کے لئے لالٹین ہوا کرتی تھی - سنسان رات میں جو بھی اسے کمرے یا گھر سے باہر نظر آتا اسے جھانپڑ مار دیتی تھی - نشانہ بننے والے بدنصیب کو اس وقت درد یا تکلیف کا کوئی احساس نہ ہوتا البتہ صبح وہ گھر والوں کو مردہ حالت میں ملتا اور اس کے پیٹھ پر ہاتھ کے پنجے اور انگلیوں کی گہری چھاپ نقش ہوتی - اللہ جانتا ہے کہ کہانی سننے کے بعد ہماری وہ رات کیسے گزرتی- نیند تو درکنار ہم تو ساری رات لحاف کے آنکھ برابر سوراخ سے دروازے کے درزوں کو خوف سے تکتے تکتے صبح کر دیتے - سردیوں کی انتہائی تاریک رات، بند کمرہ، گل روشنیاں اور خوفناک کہانیاں ، ایسی ڈراونی صورتحال میں جنم لینے والے خوف کا اندازہ اگر آپ لگا سکتے ہیں تو بے شک لگا لیں؛ ہم تو اس خوف کو تحریر کرنے سے بھی قاصر ہیں- شومئی قسمت سے پیشاب کے لئے باامر مجبوری باہر جانا پڑ جاتا (اگرچہ ہماری حد درجے کوشش ہوتی کہ اس قبیح فعل کو کسی طرح صبح کے اذانوں تک موخر رکھا جائے) تو اگرچہ ہاتھ میں دادی اماں کی طرف سے سرہانے رکھی سبزی کاٹنے والی چھری بھی موجود ہوتی، پھر بھی خوف سے تھر تھر کانپتے اور صبح ہوتے ہی اپنی پیٹھ کو ننگا کر کے دو تین گھر والوں کو ضرور دکھاتے کہ دیکھیں! کہیں ہماری پیٹھ پہ چڑیل کا دستی پنجہ تو نہیں کھدا ہوا - بدلتی راتوں میں چڑیل کی مسلسل بدلتی کہانیاں سن سن کے ہماری بہادری کا متواتر خون ہوتا رہا-

علم نفسیات کا قاعدہ ہے کہ جس ذی روح سے تنقید و اعتراض کا خدشہ ہوا سے خوف میں مبتلا کر دو، نقد و غرض کا مادہ خود ہی دم توڑ دے گا- اس دعوے میں عمرانیات اور فلسفے کے علوم بھی نفسیات کے ہم خیال دکھائی دیتے ہیں جبھی تو ہر انسانی معاشرے میں اس اصول اور قاعدے کا دل کھول کر استعمال کیا جاتا رہا ہے اور یقیناً" اس کے دیرپا اور حسب خواہش و ضرورت نتائج بھی ضرور نکلتے ہوں گے- بچپن میں ہمارے والدین اور بزرگ اس قانون کو کھلے عام استعمال کر کے مقصد تک رسائی پاتے ہیں - سکول میں اساتذہ اس قاعدے کا بھرپور اور مؤثر استعمال یقینی بناتے ہیں - معاشرے میں موجود طاقتور سورما بزور بازو اس کلئے کو نافذ کرتے ہیں اور یوں ان تمام سانچوں سے نکل کر بندہ اتنا بزدل اور ڈرپوک بن جاتا ہے کہ اپنے سائے سے بھی خوف کھانے لگتا ہے- حق مانگنا اور سچ پہ قائم رہنا اس کے بس کی بات نہیں رہتی - شادی کے بعد بیگم محترمہ بھی اسی کلئے کو اپنا کر ثواب دارین پاتی ہیں- والدین مؤدب بنانے کے لئے، اساتذہ تابعداری کے لئے اور طاقتور سورما اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے اس قانون کا سہارا لیتے ہیں جب کہ بیگم صاحبہ شوہر نامدار کو مطیع و فرمانبردار بنانے کے اس آہنی قانون

کو ہاتھ میں لیتی ہیں -
ہمارے والدین رموز و آداب سکھانے کے لئے بھی اسی خوف کے قاعدے سے کام لیتے تھے- مثلاً" جھوٹ بولا یا کسی کو گالی دی تو زبان پر پھوڑا نکل آئے گا؛ روٹی کو سونگھا تو بندر بن جاو گے وغیرہ اور ہر قاعدے کے ساتھ وہ کسی کی فرضی کہانی شامل کر لیتے تھے- "دیکھا نہیں تھا، جھوٹ اور گالیوں سے فلاں کی زبان پہ اتنا بڑا پھوڑا نکل آیا تھا"-

"بہت پہلے بابا اشتر کے گھر میں بچہ بندر بن گیا تھا، روٹی کو جو سونگھا تھا اس نے "!!!!---
چنانچہ یہ خوف اتنا جم کر دماغ میں بیٹھ گیا کہ لڑکپن تک اگر نادانستہ طور پر زبان سے گالی نکلی تو زبان پہ پھوڑا نکلنے کا انتظار کرتے رہے یا کبھی روٹی کی مہک ناک کے اندر تک جا گھسی تو خوفزدہ ہو ہو کے اپنے بندر بننے کی راہ دیکھتے رہے اور بار بار آئینہ دیکھتے رہتے کہ بندر بننے کا عمل ابھی شروع ہوا یا نہیں!!!

دوسری منزل جہاں ہمیں ڈر اور خوف کی خوراک ثانی گھوٹ کے پلائی گئی، وہ سکول تھا- استاد محترم نام سے اولین تعارف ایک ایسے جابر شخص کی روپ میں ہوا جو ہمیشہ ہاتھ میں چار فٹ کا لمبا بید تھامے کرسی پر براجمان رہتا ہے اور کلاس میں سرزد ہونے والے ہر کردہ و ناکردہ جرم کا حساب اسی ڈنڈے سے لیتا ہے- ناکردہ اس لئے کہ اکثر اوقات شور دوسرے بچے کرتے اور ڈنڈا ہم پہ برسنے لگتا- شرارت دوسرے کرتے اور سزا میں ہمیں برابر کا حصہ دار ٹھہرایا جاتا - یہاں ہمیں خوف کی نئی نئی صورتوں سے آشنائی نصیب ہوئی - سبق یاد نہ کرنے کا خوف، کاپی اور تختی نہ لکھنے کا خوف اور سب سے بڑھ کر امتحان اور پاس نہ ہونے کا خوف- اول الذکر دو صورتوں میں جسمانی سزا ملتی تھی جبکہ موخر الذکر میں سال ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا تھا- جسمانی سزا شارٹ ٹرم اقدام تھا اور یہی ہمیں ڈرا کے رکھنے کے لئے کافی تھا- اس سزا کا انحصار استاد محترم کے اس دن کے رویے اور اس صبح کو ان کے گھریلو ماحول پر تھا - لہٰذا صبح سکول جاتے ہوئے استاد مکرم کے گھر کے قریب سے گزر کے جاتے کہ دیکھیں کہیں صاحب کے گھر صبح ہی صبح لڑائی تو نہیں شروع - ہاتھوں پر ڈنڈے رسید کرنا، ڈیسک پر کھڑا کرنا، دوسرے طالبعلم سے منہ پہ تھپڑ دلوانا اور مرغا بنانا اس سزا کی مختلف شکلیں تھیں- جس دن خوش قسمتی سے استاد محترم چھٹی پر ہوتے وہ دن گویا ہمارے لئے عید کا دن ہوتا اور ہم دعائیں مانگتے کہ اے اللہ! آج کا دن کبھی ختم نہ ہو!!!!!-------
خدا خدا کر کے سکول کے مرحلے سے نکلے تو کالج میں نسبتاً کم ڈراونا ماحول ملا- یہاں پر اگرچہ ہمیں آزادی میسر آئی مگر امتحان، پاس فیل اور اعلیٰ گریڈز حاصل کرنے کا خوف پھر بھی طاری رہا- اور یوں عملی زندگی کے بہتر

آغاز وابتداء کے لئے جس قدر جرأت ، عزم اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں پیدا ہی نہ ہو پایا- کسی دفتر میں کلرک تک سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا ہم میں- کسی ناکے پہ پولیس کو تلاشی لیتے دیکھتے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے- رنگت زرد پڑ جاتی اور پولیس کا شک فورا" ہی یقین میں بدل جاتا کہ ہو نہ ہو یہی پکا مجرم ہے اور گاڑی سے اتار کے تلاشی لی جاتی - جان اس وقت چھوٹتی جب سارے جیبوں کی تلاشی مکمل ہو جاتی اور کچھ بھی برآمد نہ ہوتا- انتہائی خواہش کے باوجود عشق کرنے جیسے اہم اور ضروری کام سے اجتناب کیا کہ پتہ نہیں بعد میں نجانے برادران محبوب مع اپنے والد بزرگوار کے کیا سلوک کر بیٹھیں !!!

شادی کے بعد بیگم صاحبہ کے لئے ہم نہایت ہی آسان شکار ثابت ہوئے اور یوں ہمیں قابو کرنے کے لئے انہیں زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے- ہم پہلے ہی سے خوف کے مارے ہوئے تھے؛ جب سماج کے سامنے بہادری کا مظاہرہ نہ کر سکے تو بیگم بیچاری کے سامنے اس قسم کی حرکت کرنا کہاں کی دانشمندی ہے- سو بیگم کا ہر حکم سر آنکھوں پر- جو وہ زبان سے ادا فرماتی ہیں اسے بجالانے کے لئے ہم ہمیشہ خود کو تیار و مستعد پاتے ہیں -کبھی بھی کوتاہی نہیں ہوتی اور نہ ہی کبھی سستی و کسالت کا مظاہرہ کرتے ہیں -

چند دن پہلے ایک قریبی عزیز کے ہاں جانا ہوا- جیسے ہی ہم نے ان کے گھر کی دہلیز پار کی ، ایک معصوم بچے کے چیخنے کی دلخراش آوازیں کان میں پڑیں - یا اللہ خیر کہہ کر آوازوں کی جانب بڑھے- دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے عزیز اپنے ڈھائی تین سالہ بچے کو کنویں کے اوپر لگے ڈول میں بٹھا کے رسی کے ذریعے نیچے گہرے کنویں میں لٹکا کے گراتے ہیں اور جب ڈول آدھے کنویں تک پہنچ جاتا ہے تو رسی سے بندھی ڈول کو بچے سمیت کھینچ کر اوپر لاتے ہیں- بچے کی دل خراش چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں- عزیز موصوف ان چیخوں سے بے نیاز بار بار یہ عمل دہرا رہے تھے- میں نے جلدی سے رسی کو ان کے ہاتھ سے چھین کر بچے کو نکالا- شعلہ بار نظروں سے عزیز کو دیکھتے ہوئے پوچھا؛ " بھئی!! یہ کیا ہو رہا تھا بھلا"------

عزیز محترم پرسکون لہجے میں بولے،" کچھ نہیں بھائی جان؛ بس ذرا بچے کے دل کو مظبوط بنانے کی کوشش کر رہا تھا- چاہتا ہوں کہ بچہ مظبوط اعصاب کا مالک بنے؛ دلیر اور جی دار بن کر زندگی گزارے اور کسی چیز سے نہ گھبرائے"-

ششدر رہ گئے -ہم نے ان کی باتوں کا تو کوئی جواب نہ دیا مگر اپنے دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگے کہ شکر ہے ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوا- یہ بچہ تو بہادر تھا کہ اپنے خوف کو چیخوں تک محدود کر دیا- اس کی جگہ ہم ہوتے تو ہماری تو پانی کے ڈول ہی میں جان نکل جاتی!!!!!!!----

☆☆☆☆☆

ہمارا مولانا وحیدالدین سلیم [خاکہ]

ڈپٹی نذیر احمد واقعی بہت خوش قسمت تھے جن کو فرحت اللہ بیگ جیسا شاگرد نصیب ہوا اور ان کا یادگار خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' لکھا۔ اس کے بعد فرحت نے مولانا وحید الدین سلیم کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے ایک اور لاجواب خاکہ لکھا اور مولانا کے نام اور کام کو ہمیشہ کے لیے امر کرالیا۔

مجھے تو نہ تو فرحت کی طرح الفاظ کی صورت گری آتی ہے اور نہ واقعات و حادثات کی نقش گری، کہ جس کے بارے میں لکھا وہ پتھر کی لکیر بنا اور جس کے متعلق قلم اٹھایا وہ شاہکار ٹھہرا، بس ادھر ادھر کی ہانک کر دل پشوری کر لیتے ہیں اور انگلی کٹا کے شہیدوں میں نام کرنے کی رسم پوری کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

آج میں جس شخصیت پر کچھ لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں انھوں نے نہ تو مجھے کوئی وصیت کی ہے کہ میرے مرنے کے بعد آپ میرے بارے میں لکھیں اور نہ کوئی نصیحت، لیکن جب بھی میں نے فرحت کا مولانا والا خاکہ پڑھا تو سامنے ملک لیث محمد صاحب مجسم مسکراتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیئے اور مجھے انھیں اپنا مولانا وحیدالدین سلیم کہنا پڑا۔

مولانا سے میری شناسائی بیس سال پہلے اس وقت ہوئی تھی جب میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے بی ایڈ کر رہا تھا، ایک اسائنمنٹ لکھ کر ایک دن پوچھتے پوچھتے مولانا کے آستانے گوجر گڑھی پہنچا، خوش قسمتی سے مولانا گھر پر موجود تھے سلام دعا کے بعد جب میں نے عرض کیا کہ میں پشاور یونی ورسٹی سے ریگولر طالب علم کی حیثیت ایم اے اردو کر رہا ہوں تو انھوں نے ایک دفعہ پھر ہاتھ ملا کر شاباش دی اور میری بہت خاطر مدارت کی۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کلیم خارجی کی دعوت اور فضل مالک کی ترغیب پر ایک دن وہ مجبان

گوہر رحمان نوید

اردو کے اجلاس میں خراماں خراماں چلے آئے۔ بہت عرصے بعد ان کی صورت اور وضع قطع جو میں تقریباً بھول چکا تھا، دیکھ کر مجھے فرحت کے مولانا وحیدالدین سلیم یاد آ گئے۔

پتا نہیں ہمارے وحیدالدین اتنے چست کپڑے کیوں پہنتے ہیں جنھیں دیکھ کر آج کل کے چھوکرے شرما جاتے ہیں، اس پر عمر کے لحاظ سے ان کی بڑی توند الگ بہار دکھلاتی ہے، کھڑے ہونے میں تو پھر بھی پیٹ اور پیٹھ کے طول وعرض کا احساس نہیں ہوتا لیکن حضرت داغ کی طرح وہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں پھر ان کا اٹھنا محال ہو جاتا ہے اور ان کا اگلا ان سے تین فٹ آگے کی خبر لاتا ہے۔ مولانا کا رنگ سفید ہے، نورانی چہرے پر سفید داڑھی کی بہار جو کسی زمانے میں کالی ہوا کرتی تھی بلکہ ایک تصویر میں تو ہم نے دیکھا کہ داڑھی کا تو کیا ذکر مونچھ تک کا کوئی نام ونشان نہیں ہے اور موصوف پشتو فلموں کے مایہ ناز ہیرو آصف خان کی طرح لگ رہے ہیں۔ ایک دفعہ موصوف جن کا پیشہ پڑھنا پڑھانا ہے کا تبادلہ دوسرے اسکول ہوا، وہاں جماعت دہم کا ایک طالب علم ان کو دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ آصف خان کا تبادلہ ہمارے اسکول ہوا ہے، اگلے دن اس لڑکے کے دادا جو پشتو فلموں کے دلدادہ تھے آصف خان کو ایک نظر دیکھنے علی الصبح اسکول پہنچ گئے انھوں نے ہیڈ ماسٹر سے استفسار کیا کہ واقعی آپ کے اسکول میں آصف خان کا تبادلہ ہوا ہے؟ ہیڈ ماسٹر نے نفی میں جواب دیا لیکن انہیں تب تک یقین نہ آیا جب تک لیٹ محمد کو انھوں نے بچشم خود نہیں دیکھا۔

بالی عمر کے زمانے میں جب اس طرح کے خوبرو جوانوں کو کئی طرح کی لت پڑ جاتے ہیں اور وہ کہیں نہ کہیں جوانی دیوانی کے نشے میں چور ہو کر مست ملنگ بنے پھرتے ہیں ہمارے وحیدالدین سلیم کا دامن کسی حد تک ان لغزشوں سے پاک رہا۔

ستواں ناک کے نیچے کلے اور جبڑے ہمیشہ قینچی کے دست کش رہتے ہیں بلکہ ہم نے داڑھی کے علاوہ ان کے نورانی چہرے پر غیر ضروری تو کیا ضروری اور اضافی بال نہیں دیکھا جس نے ان کے گالوں کے حسن کو ماند کر رکھا ہو۔

ان کی لمبی لمبی لٹیں آج بھی ان کے شانوں پر لہرا رہی ہوتی ہیں، عمر کی سٹھ بہاریں دیکھنے کے باوجود بھی ساری کی ساری سلامت ہیں اور حالات اور گردش ایام ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے ہیں۔

یہ بال ایک زمانے میں اتنے سلیقے اور طریقے سے سرسوں کے تیل اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر ہوتے تھے کہ ان کی صحبت میں بیٹھے ہوئے خواتین وحضرات کے علاوہ راہ چلتے ہوئے جن

موافق کی رغبت رکھنے والے دل جلوں کے ہونٹوں سے بھی بے اختیار توصیفی کلمات نکلتے تھے، یہ پہلے ٹوپی کے زیر اثر آئے اور آج کل ایک بڑی پگڑی کے نیچے دبکے پڑے رہتے ہیں۔

جب وہ اور میر عالم سید صاحب پشاور یونی ورسٹی سے ایم ایڈ کر رہے تھے اور دونوں کے حسن کا سمندر ٹاٹیں مار رہا تھا، ان کے ساتھ مردان کا ایک اور کالا کلوٹا ساتھی فقیر محمد بھی تھا تو ایک دن وہ تینوں یونی ورسٹی سے بس میں بیٹھ کر جب اڈے جا رہے تھے تو ان کے ساتھ چند خواتین بھی بس میں بیٹھ گئیں، تھوڑی دیر بعد جب انھوں نے ایک دوسرے سے باتیں شروع کیں جو اس زمانے میں بڑی معیوب سمجھی جاتی تھیں تو بس کی دوسری سواریوں کے کنڈکٹر کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا کہ یہ دو وجیہہ نوجوان کس طرح سرعام خواتین کے ساتھ ہم کلام ہیں، آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے لیٹ محمد سے پوچھ ہی لیا کہ آپ لوگ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟، انھوں نے جھٹ سے جواب دیا کہ ہم تیسری جنس سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ مجرا کرنے والی مستورات ہیں اور نشتر حال میں پروگرام کے لیے جا رہے ہیں، کنڈکٹر نے اک اور سوال داغ دیا اور فقیر محمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا لیکن یہ کون ہے؟ لیٹ محمد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، "یہ ہمارا دلال ہے"۔

کنڈکٹر تو خاموش ہو گیا، لیکن بس سے اترنے کے بعد فقیر محمد نے اس سنگین مذاق پر خوب واویلا مچایا اور کئی دنوں تک موصوف سے ناراض رہے۔

ان کے حسن کرشمہ ساز کو دیکھ کر عین ممکن ہے کہ پشاور یونی ورسٹی کے دریائے لطافت کے علاوہ بھی کسی الہڑ دوشیزہ نے ان کی قربت حاصل کرنے کے لیے چکر لگایا ہو اور ہمارے مولانا نے اس کے ساتھ کوئی چکر چلایا ہو، اس لیے ان کی پاکیٔ داماں کی حکایات پر ہم زیادہ اعتبار بھی نہیں کر سکتے۔ عین ممکن ہے کہ وہ لذت گناہ کی حسرت دل میں لیے پھرتے رہے ہوں لیکن ذلت گناہ کا خوف ہر وقت ان کے دامن گیر رہا۔ یا تو خاندانی وجاہت کا اثر تھا یا مولانا کی طبعی شرافت یا شاید مناسب جگہ کی عدم ستیابی کہ ہمارے مولانا ایک آدھ چانس اویل کرنے کے بعد توبہ تائب ہو گئے اور شرافت کا ایسا پائیدار لبادہ اوڑھ لیا جو آج کل بھی اپنی لمبائی و چوڑائی میں اپنی مثال آپ ہے۔

دونوں کا تعلق مسلم لیگ کے ساتھ ہے ایک دو قومی نظریے کے خالق سرسید کا دست راست اور دوسرا دو قومی نظریے کا پرچارک۔ مولانا وحید الدین سلیم جس طرح مسلم لیگ کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں اسی طرح ہمارا مولانا بھی پیدائشی طور پر مسلم لیگی ہیں،

ان کے والد ملک نور حدین تحریک پاکستان کے ایک ایسے مجاہد تھے جنھوں نے اس دیس کی آزادی کے لیے اپنا تن من دھن داؤ پر لگایا اور قائداعظم، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کی معیت میں آزادی کی نیلم پری کے لیے جدوجہد کی۔

ہمارے وحیدالدین سلیم کو پاکستان سے عشق ہے بلکہ ان کی صورت میں ایک چلتا پھرتا پاکستان آپ کو نظر آئے گا پگڑی کے عین وسط میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم کا حسن ماتھے پر سجائے جب وہ کہیں پہ رونق افروز ہوتے ہیں تو سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

پاکستان کے ساتھ ساتھ اردو بھی ان کی سرشت میں رچی بسی ہے جہاں بھی کوئی اردو کی مخالفت میں بات کرتا ہے مولانا زبان و بیان کے پورے لاؤلشکر کے ساتھ ان کی ایسی خبر لیتے ہیں کہ مخالف کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں، اس کے برعکس جو اردو کی ترویج و ترقی کے لیے آواز اٹھاتا ہے مولانا اپنی دلی ایمانداری اور قومی جوش کے ساتھ اس خروش کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ہمارے وحیدالدین سلیم فرحت کے وحیدالدین کی طرح کنجوس مکھی چوس نہیں ہے بلکہ جس طرح ان کا حوصلہ فراخ ہے اسی طرح ان کا دل بھی بہت بڑا ہے۔ وہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا والے بھی نہیں ہے بلکہ ایک عدد شادی رچا چکے ہیں اور تین عدد اولاد کی صورت میں اپنی بہترین پیداواری صلاحیت کا نقش دنیا پہ بٹھا چکے ہیں۔

اپنی زندگی کو ایسی اعتدال پر رکھا ہے کہ نہ جہاں ان پر ہنستا ہے اور نہ خوشی ان پہ روتی ہے۔ دولت جس کا کاٹے کا منتر نہیں، ہمارے وحیدالدین نے جمع کرنے کی ہوس کبھی نہیں، بلکہ دولت کے وبال سے اپنے آپ کو بچا کر اپنے ہم عصروں میں سرخ روئی کے ساتھ کھڑے ہیں۔

ہمارے مولانا گوجروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ ذات پات کی تفریق کا زہر ہمارے معاشرے کی رگ و پے میں بری طرح سرایت کر چکا ہے اور عام طور پر ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، لیکن موصوف نے اپنے بال و پر کو غبار آلودہ رنگ و نسب کرنے اور من و تو کے بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے قرب و جوار میں اپنی خودداری، وضع داری اور حسن سلوک کا ایسا جادو پھونکا ہے کہ بڑے بڑے خاندان ان کی عظمت کا دم بھرتے نظر آ رہے ہیں۔

جس طرح عین لڑائی میں نماز کا وقت آتا تو محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے اسی طرح محبان اردو کے اجلاس کے دوران جب بھی نماز کا وقت آتا ہے تو ہمارے وحیدالدین کے اندر کا مولوی

انگڑائی لینے لگتا ہے اور اقبال کا یہ شعر گنگناتے ہوئے امامت کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

ان کی سرپرستی میں ایسی باجماعت ادبی تنظیم باستثنیٰ پت پختو ادبی ٹولنہ کے مردان تو کیا پورے پختونخوا بلکہ پورے ملک میں ملنا محال ہے۔

فرحت کے وحیدالدین کی طرح ہمارے مولانا کی زبان بھی چلتی ہے لیکن قینچی کی طرح نہیں، جس سے مخالف بے چارہ ادھ موا ہوجائے۔ محفل آراستہ انسان ہیں اور توہم کے اس کارخانے میں یقیں کی دولت سے مالامال ہیں، چندلمحوں میں ساری محفل کو اپنی شیریں گفتاری سے گرفت میں لے لیتے ہیں، شعر پڑھتے ہیں، چٹکلے چھوڑتے ہیں، واقعات سناتے ہیں، کبھی کبھی تو مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے ہیں۔ پشتو تو ان کی مادری زبان ہے لیکن انگریزی اور اردو بھی روانی اور فراوانی سے بولتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے مولانا بسم اللہ کی گنبد میں رہ کر آئے ہیں، کسی زمانے میں تصوف کے دشت خارزار کی سیاحی بھی کی، چشتیہ اور قادریہ کے سلسلوں میں بیعت ہوئے اور سلوک کے کئی منازل طے کیے، جب ان کے دل میں یقیں کے ثبات نے گمانوں کے لشکر کو مات دینے کی کوشش کی اور قریب تھا کہ اگر دامن نچوڑنے بیٹھ جاتے تو فرشتے وضو کرنے آجاتے، لیکن بدقسمتی سے پھر وہی دنیاوی آلائشیں آڑے آئیں اور مولانا ادھر کے بجائے مکمل طور پر ادھر کے ہوگئے۔

صاحب لطیفہ باز بھی ہیں اور جملہ باز بھی، ان کا کہنا ہے کہ ہمارے پچاس فیصد پاکستانی تعویز گنڈوں سے اور باقی پچاس فیصد پروپیگنڈوں سے گمراہ ہوتے ہیں۔

مشاہدہ ہے جب انسان کی وضع قطع خوب صورت ہو، ناک نقشہ منفرد ہو اور اوپر سے لیاقت اور سلیقہ بھی آتا ہو اور اپنے ہم جنسوں میں ان کی انفرادیت کا ڈنکا بجتا ہو، تو تفاخر وغرور اور نرگسیت کا شکار ہوجاتا ہے لیکن ہمارے وحیدالدین نے نرگسیت کی پاسپورٹ پہ سفر کرنے کے بجائے قفس کی طرح اپنے ہی خاکستر سے بال وپر پیدا کیے اور پختون نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرانے میں بھرپور کردار ادا کیا، بے شمار شاگرد پیدا کیے، ہزاروں کی راہنمائی کی اور لاکھوں تک امن وآشتی کا پیغام پہنچایا، یہی ان کی کل کائنات ہے اور یہی ان کی دین جو رہتی دنیا تک نسل درنسل چلتا رہے گا اور ملک لیث محمد کے لیے دنیا وآخرت کی سرخ روئی کا باعث بنے گا۔

☆☆☆☆☆

جمشید اعظم چشتی اور ان کی ''جھلمل'' شاعری: ایک تاثر

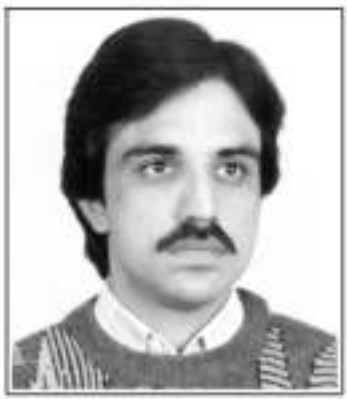

شاخ در شاخ کیسی جھلمل ہے!

موسمِ بہار کی آمد پر اِتراتے پیڑوں کی شاخیں مجھے واقعتاً جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں تین سال بعد لاہور واپس آیا تھا ریڈیو دوچے ویلے (دی وائس آف جرمنی) کی اردو نشریات میں بطور پروڈیوسر اپنی مدتِ ملازمت مکمل کر کے --- اور یہاں پہونچتے ہی اوّلین ترجیح کے طور پر سلام عرض کرنے خالد احمد صاحب کے دفتر یعنی واپڈا ہاؤس کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ میں جا حاضر ہوا تھا --- واپڈا ہاؤس کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے اُن دنوں کیسے کیسے خوب صورت تخلیق کار وابستہ تھے؛ خالد احمد، خالد صدیقی، رضا صدیقی، افتخار مجاز اور کئی دوسرے۔ میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ ذکر ہے سنہ ۱۹۹۳ کے موسمِ بہار کا۔ خالد صاحب نے حسبِ عادت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور حسبِ مزاج کچھ تُرش و شیریں جملوں کے ساتھ میری 'خبر گیری' بھی کی اور پھر اپنے سامنے بیٹھے ایک نوجوان مہمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے:

''اس سے ملو، یہ کئی اعتبار سے تمہارا بھائی ہے۔'' دل نواز مسکان چہرے پر سجائے نوجوان نے انتہائی نفاست سے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھا دیا۔ اور ہم دونوں خالد صاحب کے اگلے جملے یا 'حملے' کا انتظار کرنے لگے۔

''پہلی بات یہ کہ بھی شاعر ہے'' خالد صاحب نے چائے پر جمی پپڑی کو شہادت

حامد یزدانی

والی انگلی سے ہٹایا۔

''دیکھو، قدرت کا بھی فیصلہ یہی ہے کہ چائے گرم نوش کی جائے اِسی لیے اس نے اس پپڑی کی صورت میں خودساختہ پلیٹ کا بندوبست کر رکھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے چائے کی ایک چسکی لی اور ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے واپس پہلے والی بات پر آ گئے۔

''ہاں تو پہلی مشترک بات یہ کہ یہ بھی شاعر ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے والد بھی شاعر ہیں اور تیسری بات یہ کہ تم دونوں۔۔۔ ایک ہی رسّی میں باندھنے والے ہو۔۔۔'' اور ایک قہقہہ لگایا تھا۔

''اس تیسرے اعزاز کا سبب؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں۔۔۔وہ یہ کہ یہ بھی میرے پاس خود نہیں آیا۔ اس کو بھی اس کے ابا جی نے میرے پاس بھیجا تھا۔۔۔ تو ایک بات تو پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ الحمدللہ تم دونوں ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہو۔'' چائے کی ایک اور چسکی لی۔ بلند آواز سے چائے کے ٹھنڈا ہو جانے کی شکایت کی تاکہ دوسرے کیبن میں چائے بنانے پر مامور ہم۔ کارسُن لیں اور تازہ چائے دے جائیں۔ سگریٹ کی ڈبیا کو اُٹھایا۔ اسے کھولا مگر جانے کیا سوچ کر سگریٹ نکالے بغیر ہی واپس میز پر رکھ دیا اور پھر سے ہماری جانب مُڑے اور پہلے مجھ سے مخاطب ہوئے:

''بھئی، یہ ہے جمشید چشتی، ہمارے بہت محترم اعظم چشتی صاحب کا بیٹا'' اور پھر جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''اس کا نام ہے حامد یزدانی اور یہ ہمارے پیارے بزرگ شاعر یزدانی جالندھری صاحب کا برخوردار ہے اور اسے بھی یزدانی صاحب نے میری طرف بھیجا تھا۔'' پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولے:

''لو بھئی میرا کام ختم ہوا۔ دونوں شاعر ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اب باقی کام تم خود کر لو مجھے اور بھی کام ہیں''۔ اور اُٹھ کر خالد صدیقی صاحب کے کیبن کی طرف چلے گئے۔ ہم دونوں نے کچھ رسمی جملوں کا تبادلہ کیا۔ چند شعر سنے اور سنائے۔ اتنے میں خالد صاحب واپس آ گئے اور ہمیں ''بیاض'' کے دفتر پہونچنے کا حکم دیا اور ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی ایبٹ روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔ یوں خالد صاحب کی وساطت سے میں جدید تر شاعری کے ایک نمائندہ شاعر سے متعارف ہوا۔

خوش فکر اور خوش آواز شاعر جمشید چشتی سے میری یہ پہلی مختصر سی ملاقات کب ایک مستقل دوستی کی صورت اختیار کر گئی، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سارا کمال جمشید کی شخصیت میں موجزن اس تہذیب و خلوص کا ہے جو انہیں اپنے محبت کرنے والے گھرانے سے بہ طور وراثت بھی

ملے اور بہ انداز تربیت بھی۔ ان کے والد گرامی جناب اعظم چشتی کا نام اردو شعر وادب بالخصوص نعت سرورِ کونین کے حوالہ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اور والد گرامی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اب جمشید بھی اردو شاعری کے قریے میں نام وری کے نئے نقوش ثبت کرنے میں کوشاں ہیں۔ اللہ کریم جمشید کے حرف کو سدا در قبول تک باریاب رکھے، آمین بجاہ سید المرسلینؐ۔

جمشید اعظم چشتی کا مجموعۂ کلام کئی برس ہوئے مجھے موصول ہوا اور میں نے اس پر اپنا ایک مختصر تاثر بھی لکھ کر انہیں بھیج دیا تھا جس میں ان کی شاعری کا سرسری جائزہ پیش کرنے کی سعی کی تھی۔ ان کے اس مجموعہ کو ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی ملی اور ادارہ 'بیاض' کی جانب سے سال کے بہترین شعری مجموعہ کا اعزاز بھی دیا گیا۔ میرا اعزاز یہ رہا کہ میں نے اس مجموعہ میں شامل جمشید کی دل کش شاعری سے بھی استفادہ کیا اور اس میں شامل مقتدر آرا سے بھی لطف اٹھایا۔ خواجہ زکریا صاحب نے کیا عمدہ بات کی ہے کہ اس نوجوان شاعر کے کلام کی کشش نے انھیں بہت متاثر کیا ہے اور یہ کہ شعر کہتے ہوئے جمشید تساہل سے کام نہیں لیتے۔ گویا پوری دل جمعی اور دیانت داری سے حقِ فن ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب جمشید کی شاعری کے حوالہ سے فرماتے ہیں: ''اس کے کلام کا رنگ و آہنگ دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس نے بجا طور پر خود کو شاعری اور موسیقی کے فنون لطیفہ کا مرکب قرار دیا ہے۔ ہر اچھے اور سچے شاعر کی طرح جمشید اپنے فن میں شدت احساس کی تلوار جیسی تیز دھار پر چلتا نظر آتا ہے۔'' اور پھر نجیب احمد صاحب کا تجزیہ بھی کتنا کھرا ہے کہ'' خارجی عوامل کی طرح جمشید چشتی نے واردات قلب کو بھی انتہائی عمدگی کے ساتھ زینتِ قرطاس بنایا ہے۔ فراق کی دھوپ میں جلنے کے باوجود وصال کی ٹھنڈک کا احساس اس کے لہجے کو تر و تازہ اور چاشنی سے لبریز رکھتا ہے۔ بڑے ہی سیدھے سادے سبھاؤ میں یہ فنکار اپنے اندر کی توڑ پھوڑ اور اس توڑ پھوڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دکھ کو کچھ اس ڈھب سے الفاظ کے دھاگے میں پروتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کو یہ دکھ اس کا اپنا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ بین السطور چلنے والی کرب کی اس ملکی سی لہر نے جمشید چشتی کی شاعری میں بلا کا رچاؤ پیدا کر دیا ہے۔ جمشید چشتی کی شاعری اہل فکر اور اہل نظر کو اپنی گرفت میں لینے کی اہلیت رکھتی ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ جمشید کی شاعری نے میری توجہ کو واقعی اپنی گرفت میں لے لیا اور میں ان کی شاعری کی ''جھلمل'' میں گم ہوتا چلا

گیا۔ یہ مجموعہ جس کا آغاز سید المرسلینؐ کی شان میں ایک دل کش قصیدہ سے ہوتا ہے فوراً اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ دل کش قصیدہ جہاں ممدوحِ مکرم سے شاعر کی محبت و عقیدت کی گواہی دیتا ہے وہاں قابلِ ستائش فنی پختگی اور سلیقۂ اظہار کی بھی غمازی کرتا ہے۔ نعت کے حوالہ سے اردو کا دامن بہت باثروت ہے۔ کتنے ہی عظیم شعرا نے اس صنف کو اپنے دل کے قریب رکھا، دل میں اتر جانے والے اشعار کہے اور آقاؐ کے ثنا خوانوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا کر سُرخ رو ہوئے۔ تاہم میرا احساس یہ ہے کہ ہماری نسل کے شعرا کی نعتوں اور بالخصوص نعتیہ قصائد میں حُسنِ عقیدت کی جو مہک رواں ہے اس میں اردو میں جدید تر نعتیہ قصیدہ کے نقشِ اولیں جناب خالد احمد کی ''تشبیب'' کا بہت حصہ ہے۔ جمشید کی خوش قسمتی کی کوئی انتہا نہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انہیں نہ صرف اعظم چشتی صاحب جیسے عاشق رسول والد عطا فرمائے بلکہ احمد ندیم قاسمی صاحب جیسے مہربان راہبر اور ذہن رسا کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی شعریات سے گہرا لگاؤ بھی عطا فرمایا۔ ورنہ ایسا نعتیہ قصیدہ ہر کسی کو کہاں نصیب!

''جھلمل'' میں شامل نظمیں اور غزلیں بھی شعری اظہار پر جمشید کی حیرت انگیز قدرت کی شاہد ہیں۔ نظموں کے موضوعاتی تنوع سے لے کر غزل کے شدت اظہار تک اس مجموعہ کا دامن حسن و جمال کے ان مول موتیوں سے مالا مال ہے۔ جمشید کے شعر میں موجود حیرت اور استفہام کا عنصر ان کے آئینۂ اظہار کا ایک نمایاں رخ ہے۔ 'ہے میری آنکھ میں حیرت کے ساتھ جھلمل بھی' کہتے ہوئے جمشید چشتی معصوم حیرت سے کیے گئے استفسارات کی آڑ میں اپنے قاری کو کیا کیا دل نشیں جوابات فراہم کرتے چلے جاتے ہیں:

بھر گئیں ان میں بجلیاں کیسے؟
بن گئے پھول تتلیاں کیسے؟
اس کو چھوتے ہی دیکھ لو جمشید
جل اٹھیں میری انگلیاں کیسے

.....

سامنا سائے کا سورج سے کبھی ہو نہ سکا
زاویے کتنے ہی جمشید بدل کر دیکھے

.....

نہ زمیں ہوں نہ آسمان ہوں میں
جھوٹ اور سچ کے درمیان ہوں میں

.....

فلک کو چھو کے بھی جمشید میں زمیں پہ رہا
کہ ایستادہ مرا وہم، اک یقیں پہ رہا

.....

پھول اک روند دیا تھا میں نے
آج تک پاؤں کا چھالا نہ گیا

.....

نظموں کی بات کریں تو اس مجموعہ میں شامل "چاندنی رقص میں تھی" "دن کا چاند" "پرندہ لوٹ کر آیا نہیں" "کاغذ کی زمین" اور "آخری خواہش" خاصے کی نظمیں ہیں۔۔۔ "آخری خواہش" کا مطالعہ تو بجا طور پر ندیم صاحب کے موثر اور خوب صورت طرز احساس کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ سبحان اللہ!

جمشید کی طویل کاوش "شکستِ خواب" اپنے موضوع اور منفرد طرز اظہار کی تفہیم کے حوالے سے ایک جداگانہ تحریر کی متقاضی ہے۔ تاہم تخلیقی زندگی اور تخلیقِ فن کے پراسرار عمل اور تخلیقی واردات پر جمشید کی نظم "زنجیرِ سخن" ایک نہایت بلیغ اظہاریہ ہے:

سانس لیتا ہوں کہ سینے میں گرہ پڑتی ہے
گرہیں پڑتی ہیں کہ زنجیر سی بن جاتی ہے
یہی زنجیر چھنکتی ہے تو آواز کے رنگ
میری آنکھوں میں پھسل جاتے ہیں
۔۔ سطر در سطر تری یاد بکھر جاتی ہے
۔۔ اور اس سطر کے پہلو میں نئی نظم کھڑی ہوتی ہے

....

ہر نئی نظم کے پیروں میں گئی رات کی زنجیر پڑی ہوتی ہے۔

جمشید کی شاعری کو حسن و خیر کی شاعری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے احساس کی سچی شدت، لہجے کے گداز اور اظہار کی نرمی سے دکھی دلوں کو تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ فی الواقع شعلہ بیانی سے دُور ہے۔ وہ تو حالات کی حدت سے جھلستے لمحات کو لطیف طراوت سے آشنا کرنے پر مامور ہے۔ جمشید خود کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں کہ:

میرا لہجہ تو ہے بارش کی طرح
میں کہاں شعلہ بیانی کے لیے

....

سچی شاعری کے بارے میں اساتذۂ فن کا یہ احساس کتنا دل خوش کن ہے کہ اچھی شاعری ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ جمشید چشتی کی پرتاثیر شاعری پڑھتے ہوئے یہ احساس قاری پر ایک بشارت ہی کی طرح اترتا ہے کہ افقِ تخلیق پر اس شاعری کی جھلمل بھی لازوال ٹھہرے گی کیونکہ اسے شاعر نے اپنے فنی اخلاص اور اصیل جذبات کے ستاروں سے سجایا ہے۔ جمشید نے اپنی شاعری میں خود میرے اس احساس کی سچائی کی تائید کی ہے جو دعا کی صورت لبِ امکاں پہ روشن ہے:

رہے گی صبحِ ابد تک مرے کلام کی لو

....

اور اس کلام کی لو ابد گیر تو ہوگی ہی۔۔۔ کہ نخلِ زاروقت کی جھلمل جھلمل کرتی شاخ شاخ جانتی ہے کہ یہاں:

سطر در سطر غم نگار ہے کون!

☆☆☆☆☆

ایک منفرد طبع زاد اُردو مثنوی ''کتاب نامہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

Abstract

In the decade of 80s among those who excelled in the arena of poetry. criticism and research. one prominent name is of Dr. Arshad Mehmood Nashad.His book Kitab Nama is that kind of his poetic creation shich reflects the importance and multiple qualities of a book in an impressive and attractive style and revives the tradition of love for book on the pattern of masnavi. In the article under review we have tried to explore the range of his poetic plus points collected in the form of Kitab Nama.

نثار ترابی

80ء کی دہائی میں جن تخلیق کاروں نے شاعری، تنقیدی اور تحقیقی کے شعبوں میں ریاضتِ فکر وفن کی بدولت، خصوصی توجہ اور شہرت پائی ہے ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا بھی ہے۔ شعبۂ تدریس سے وابستہ اِس توانا لب و لہجے کے حامل شاعر اور ایک باریک بین محقق نے یوں تو شعر و نثر کی حامل مختلف اصناف کو اپنا مرکز نگاہ بنا کر خوش آئند تخلیقی جوہر دکھائے ہیں مگر شاعری کے میدان میں ان کا تخلیقی امتیاز الگ سے اپنی شناخت مکمل کرتا ہے۔ ''کتاب نامہ'' ان کی شاعرانہ خوبیوں

کی حامل ایک ایسی شعری تخلیق ہے جس میں انھوں نے کتاب کی زبانی، کتاب ہی کے ہم جہت فضائل کا بیان بہ پُر تاثیر انداز اور دل کش اسلوب میں، نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے نہایت دل آویز طرزِ اظہار میں کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پہلو اجاگر کرتے ہوئے مثنوی کی طرز پر پر کتاب دوستی کی روایت کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم نے اُن کے ایسے شاعرانہ جوہر کے امکانات تلاش کرنے کی سعی کی ہے جس کے عکس ''کتاب نامہ'' کی صورت میں یکجا ہوئے ہیں۔

....

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی تخلیق کردہ زیرِ نظر مثنوی دیکھی تو یوں لگا گویا ڈاکٹر صاحب بہ زبانِ حال قارئینِ ادب سے یہ کہہ رہے ہوں کہ:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

(۱)

اس لیے کہ مثنوی جیسی شعری صنف جس نے قریباً ڈیڑھ صدی تک اُردو کے اُفق پر راج کیا۔ آج یہ صنف تغیرِ احوال و آثار کے باعث عنقا ہو چلی ہے۔ یہی حال 'شہر آشوب' ' داستان' گوئی اور' قصیدے' کا ہے۔ ایسے میں مثنوی پر طبع آزمائی اور نہ صرف یہ کہ طبع آزمائی بلکہ بحرِ متقارب میں اس قدر سلاست و روانی اور غنائیت سے برتنا کہ طبع آزمائی، طبع زاد لگے' نہ صرف یہ کہ لائقِ تحسین ہے' بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔

کتاب نامہ دیکھتے ہی ذہن میں یادوں کی بارات اُمنڈ آتی ہے۔ ''افضل'' کی بکٹ کہانی، شیخ محبوب عالم کی ''محشر نامہ''، ''مسائلِ ہندی'' اور درد نامہ، ایسی مذہبی موضوعات پر مبنی کتب، جو مثنوی کی طرز پر ہی شمار کی جا سکتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ میاں خوب محمد چشتی کی ''خوب ترنگ''، امیں گوہروی کی ''یوسف زلیخا''، ''تولد نامہ'' اور تمام یادوں کی بنیاد بننے والی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' مولانا فخر دین نظامی اور میراں جی شمس العشاق کی ''خوش نامہ'' کا تصور ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ مثنوی بطور صنف اردو کے قارئین سے بہ زبان مومن یہ کہتے سنائی دیتی ہے کہ

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۲)

فکری پرواز ''مثنوی'' لکھنے والوں کی یادوں سے اٹ جاتی ہے۔ ناگاہ ذہن میں خدائے سخن میر تقی میر، مثنوی نویس شاعر اشرف علی فغاں عبدالحیٰ تاباں، قائم چاند پوری، پنڈت دیا شنکر نسیم اور انشا کی مساعی کی یادیں کروٹ

لیتی ہیں اور تمام یادوں کا اختتام میر حسن کی ''سحرالبیان'' پر ہوتا ہے کہ جو مثنویوں میں اردو ادب میں ایسے جلوہ فگن ہے جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند۔

ان تمام یادوں کا ''کتاب نامہ'' کو بطور مثنوی دیکھنے سے تعلق بھی بالکل سامنے کی بات ہے۔ ''کتاب نامہ'' کو اگر احیائے مثنوی کی باتوفیق کاوش قرار دیا جائے تو درست ہوگا۔ ایک ایسی کاوش جو کسی نے بلاشبہ ایک صدی کے بعد کی ہے۔ اس سے قبل اگر اس ذیل میں کوئی مساعی ہیں تو وہ معروف البتہ نہیں ہیں۔ جو طبقہ مثنوی سے ناآشنا ہے اس کی مناسبت قائم کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کی مختصر تاریخ و ترکیب کا اجمالی تذکرہ بھی کر دیا جائے تاکہ وہ ''کتاب نامہ'' سے کما حقہ حظ اٹھائے اور ممکنہ حد تک اس کے مطالعے سے استفادہ بھی کر سکے۔

لفظ ''مثنوی'' عربی زبان سے اردو میں وارد ہوا ہے جس کا معنی دو دو کرنا، یا دو سے ترکیب دینا کے ہیں۔ عربی میں واحد کے بعد براہ راست جمع نہیں ہوتی بلکہ دو کی تعداد کو تثنیہ کا صیغہ احاطہ تحریر و تقریر میں لاتا ہے۔ جیسے لفظ ''طفل'' واحد ہے جس کی جمع اطفال ہے۔ اس جمع کے پہلے تثنیہ ''طفلان'' ہوگی۔ (۳)

اصطلاحاً مثنوی اُس مسلسل نظم کو کہا جاتا ہے جس میں ہر دو مصرعوں کا جوڑا آپس میں ہم قافیہ و ردیف ہوتا ہے۔ لہٰذا دو مصرعوں پر مشتمل ہر شعر کی حیثیت ایک اکائی کی سی ہوتی ہے۔ چونکہ ہر شعر میں یعنی کہ بنیادی اکائی میں ہم قافیہ و ردیف مصرعوں کی پابندی کے سوا اس میں کوئی اور شرط نہیں ہوتی۔ اس لیے اس میں اظہار بیاں دیگر اصناف مثلاً غزل، قصیدہ اور پابند نظم کے مقابلے میں بہت سہل ہوتا ہے۔

مثنوی میں مزید وسعت دیگر اصناف نظم کے برعکسیہ بھی ہے کہ اس میں نہ تو کسی بحر کی پابندی لازم ہے اور نہ موضوع کی قید روا رکھی جاتی ہے۔ موضوع کی قید نہ ہونا تو اس درجے کی آزادی ہے کہ جو کئی اصناف نثر میں بھی دستیاب نہیں ہے۔ لہٰذا عشقیہ، مذہبی، صوفیانہ، رزمیہ، بزمیہ۔ ہر قسم کی مثنویاں لکھی گئی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک مثنوی میں کئی موضوعات کا احاطہ کیا جائے۔ البتہ اس کی مثالیں شاذ ہیں۔

مثنوی کے موضوعات اگرچہ متنوع ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض مذہبی مثنویاں اصلاح کے ذیل میں بھی ملتی ہیں۔ تاہم ''کتاب نامہ'' اردو میں اپنی نوع کی واحد مثنوی ہے جس کا موضوع ''کتاب'' جیسی صنف ہے جو اشیا میں شمار کی جا سکتی ہے۔

قبل ازیں اس قسم کے موضوعات کو نظم میں تو برتا گیا ہے لیکن مثنوی کا دامن اس باب میں تقریباً خالی رہا ہے۔ کتاب کی کہانی، خود اس کی زبانی، یہ طرز آپ بیتی کی نگارش کی مغربی، جاپانی اور جدید عربی ترکیب ہے اور ''کتاب نامہ'' میں ارشد محمود ناشاد نے اسے مثنوی ایسی کلاسیکی صنف میں برت کر جمع بین الاقدار سے جو حسن پیدا کیا ہے، وہ نوعیت کے اعتبار سے بجائے خود نہ صرف یہ کہ منفرد ہے، بلکہ بامعنی بھی ہے۔

کتاب نامہ کے آغاز میں جو مدحیہ اور نعتیہ اشعار ہیں وہ مثنوی کی روایت کا عمدہ اتباع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول کی حیثیت سے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اشعار کا اسلوب اگرچہ مثنوی کے مخصوص رنگ میں ڈھلا ہوا ہے تاہم ایک مکمل حمد و نعت کی دیگر خوبیاں مذکورہ اشعار میں بدرجۂ اتم ہویدا ہیں۔

مثنوی کا باقاعدہ آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

پلا ساقیا پھر مئے لالہ فام
کہ رنگین ہو جائے حسنِ کلام
(۴)

مذکورہ شعر میں بیک وقت علامہ اقبال اور میر حسن کا اسلوب یکجا دکھائی دیتا ہے۔ مصرع اولیٰ پڑھ کر اقبال کا:

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
(۵)

اور مصرع ثانی میں پر حسن کی تعلّی کا یہ انداز کہ:

نہیں مثنوی یہ ہے سحر البیان
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
(۶)

اپنی مثال آپ ہے اور ارشد محمود ناشاد کے یہاں یہ حالات حاضرہ کے تناظر میں اپنی ارتقائی سفر کو عہد حاضر کے مطابق پیش کر رہا ہے۔ اسی طرح جب وہ 'کتاب' کو ابتدائے تمدنِ انسانی سے سفر کرتا ہوا بیان کرتے ہیں تو ان کی فکری پرواز کی وسعت سامنے آتی ہے کہ کتاب کا سفر خدا سے شروع کرتے ہیں۔

مجھے سب سے اوّل خدا نے لکھا
میں کلکِ صناعت کا ہوں معجزہ
(۷)

لفظ خدا کی جگہ اللہ زیادہ مناسب ہے۔ تاہم غالباً ضرورت شعری اور محاورۂ عمومی کو مدنظر رکھ کر خدا لکھا گیا ہے۔ بعدازاں آسمانی کتب اور رسولوں کی شریعت کی نگہبان کے طور پر کتاب کا الہامی مذاہب کے حوالے سے ذکر آتا ہے اور علی الترتیب نیچری مذاہب کی کتب مقدسہ کا بھی تذکرہ احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ مذکورہ باب کا اس شعر پر اختتام کرتے ہیں:

میں سنِ حقیقت کی ایجاد ہوں
میں سارے زمانوں کی استاد ہوں
(۸)

اس کے بعد کتاب کی عظمت اور انسانیت کے کتاب سے رشتۂ استوار رکھنے کے باعث عروج کی کہانی کا بیان ہے۔ کتاب کا ارتقائی سفر اور ہڈیوں، چھالوں اور کھالوں پر لکھے جانے والے قدیم مخطوطات کا ذکر آتا ہے۔ علی الترتیب خطاطی کے مختلف انداز بھی بتائے گئے ہیں جن سے کتب نویسی کا فن پروان چڑھتا گیا اور قارئین کے لیے کتاب کو مزیّن کرتے رہنے کا سبب بنتا رہا۔ اسی ذیل میں کتاب کی جلد سازی اور مرصع کاری کے تناظر میں کیے جانے والے تجربات کا تذکرہ بھی شاملِ اشعار کیا گیا ہے۔ کتاب سے رشتہ جوڑنے کی وجہ سے انسانی بستیاں جب گنجینۂ علم و عرفان کا امتیاز کہلائیں، مراکزِ علمی کی حیثیت سے شہرت پاتی رہیں اور اعلیٰ علوم و معارف کی اشاعت و ترویج کے جو سلسلے جاری رہے اور فیوض و برکات عام ہوئیں اس سب داستان کو اجمالاً شعری روپ میں بہت فصاحت سے سمیٹا گیا ہے۔ بساطِ سیاست پر جب تہذیبوں کو وحشت نے زیر کیا تو علم دشمنی اور تہذیب شکنی نے ظلمات کی ترویج اور کتاب کی تحقیر کی۔ تاریخ انسانی میں ایسے کئی تاریک باب بھی شامل ہیں۔ ان ادوار کی نوحہ کنائی بھی یاسیت آمیز لہجے اور پُر درد اسلوب میں بیان کر دی گئی ہے۔ اس نوع کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے ارشد محمود ناشاد فی الواقع "ناشاد" دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس رزمیہ بیان کا خاتمہ جس خیال سے کیا ہے وہاں حق کی باطل پر ابدی بقا کو آشکار کر کے یاسیت کو حسنِ ظن اور ناامیدی کو امید سے بدل ڈالتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

رہا ان کا باقی نہ نام و نشان
مرا اب بھی ہے نام لیوا جہان
(۹)

یہ شعر پڑھتے ہوئے دھیان میں بے اختیار اقبال کا یہ شعر آتا ہے:

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
(۱۰)

اس کے بعد ان نابغۂ روزگار اہلِ علوم و فنون کا ذکرِ خیر کیا گیا ہے جن کی رفعت، کتاب کی مرہونِ منت ہے اور جن کے اسماء و حالات رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے بقعۂ نور رہیں گے۔ ان میں متعدد مفکرین، مصلحین، شعرا، محدثین اور فلسفی وغیرہ شامل ہیں۔ 'کتاب' کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے اور اس کی تاریخی اہمیت و

افادیت بیان کرتے ہوئے علم وعرفاں کے سبھی آفتاب ومہتاب کتاب ہی کی روشنی سے فیض یاب ہوتے بتائے گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس علمی فضیلت کی یاد آوری کتاب ہی کی زبان سے بیان کی گئی ہے:

غرض علم و دانش کے سب آفتاب
مری روشنی سے ہوئے فیض یاب
(۱۱)

اس کے بعد کے اشعار میں فضائل کتاب بینی کا مفصل بیان ہے اور اس میں ہر ہر زاویے سے حاصل ہونے والی فیض رسانی کا جائزہ لینے کی کاوش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ عالم میں موجود ہر علم، کل آگہی، تمام افکار، خیالات، معلومات، معمولات کی نہج، عروج کا سفر سبھی کچھ، کتاب ہی کے مرہونِ منت ہے۔ اس مثنوی کا آخر، عہد حاظر میں انسانیت کی کتاب سے گریز پائی اور پہلوتہی کا نوحہ ہے۔ کتاب کی زبانی، متاعِ کارواں لٹانے کی داستان نہایت رقیق الفاظ اور پر درد اسلوب میں سنائی گئی ہے۔ اس مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہونے والے افراد اور اس اغماض میں مبتلا ہونے والی اقوام کو کیا کیا محرومیاں پیش آئیں اور وہ کن کن مسائل میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب سے از سر تعلق کو استوار کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ مثنوی کا آخری شعر ایک اعلان ہے جس کی حیثیت، ''مشتری ہوشیار باش'' یا ''پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی'' کی سی ہے۔

نگاہ خبردار ! ہشیار ہو
دل زندہ ! آمادہ کار ہو
(۱۲)

'مثنوی کتاب نامہ' کا مطالعہ کرنے کے بعد ناگاہ ذہن میں یہ خیال اترتا ہے کہ ارشد محمود ناشاد نے مثنوی ایسی کالعدم صنف کو زندہ کرنے کی جس قدر کامیاب کاوش کی ہے اور جو سعادت ان کے حصے میں آئی ہے اس کا سبب قلم و کتاب سے اُن کا گہرا عشق ہے۔ مثنوی کے موضوعات اور اس کے بیانیے کو دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ صاحبانِ علم و ادب بڑی حد تک ان تمام امور سے پہلے ہی واقف ہیں، مگر وہ جذبہ جس نے ارشد محمود ناشاد سے یہ شاہکار تخلیق کرادیا۔ غالباً کتاب سے وہ رشتہ خصوصی ہے جس کی شدت اوروں کے جذبات سے سوا ہے۔ اس لئے کہ جذبات کی شدت، افکار کی پختگی اور خیالات کے رسوخ کے باعث ہی تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ فکری اعتبار سے مثنوی کا جائزہ لیا جائے تو اس کا موضوع ''کتاب نامہ'' ایک آفاقی موضوع ہے۔ جنس کی آپ بیتی کا بیان ان کی جودتِ طبع کا مظہر ہے جب کہ مثنوی کو

ذریعۂ اظہار بنانا تخلیقی ندرت کا ثبوت ہے۔ معاصر عہد میں مثنوی کو ذریعۂ اظہار بنانا تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ ان کے یہاں دونوں کو تکنیکی اعتبار سے نہایت خوبی سے جمع کیا گیا ہے۔

فنی حوالے سے بات کی جائے تو لفظیات کا عمدہ چناؤ، تراکیب سازی، سلاستِ لفظی، ندرت، ردائف وقوافی وغیرہ کے فن کارانہ استعمال سے ان کا فنِ شاعری کے دیگر لوازمات کے ساتھ ساتھ عروض پر دسترس کی عمدہ مثال ہے۔ مشکل تراکیب سے گریز کے باوجود ان کے یہاں شاعری کا قدیم رنگِ اسلوب اپنی پوری چاشنی اور شان و شوکت سے رنگ بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ سلاستِ لفظی کا حسن اپنی جگہ لیکن ناشاد صاحب حسبِ ضرورت اور حسبِ حال پرشکوہ الفاظ مختلف مقامات پر اشعار کی صورت میں نگینوں کی طرح جڑتے چلے جاتے ہیں۔

منطق اور ادب دونوں اس چیز سے روکتے ہیں کہ کسی نئی کاوش کا قدما کی کسی تحریر سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن ایک نہایت اہم نکتہ تمام آداب کی رعایت کے باجود بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی نویسی کے گذشتہ عہد کے حالات اس میں اس بات کی اجازت کا موقع دینے یا خیال لانے سے مانع تھے کہ اس مقصدیت سے ہر موضوع پر کہا جائے اور یہی وجہ ہے کہ ماسوائے چند تبلیغی نوعیت کے مذہبی موضوعات کے، مثنوی اپنے دورِ عروج میں عمومی طور پر منظوم داستان گوئی کا نمونہ ہی پیش کرتی نظر آتی ہے۔ اردو کی مشہور عالم مثنوی ''سحرالبیان'' کا موضوع بھی ایک مرصع عشقیہ داستان ہے اور اس کا مقصد بھی شاہ کی خوشنودی اور تلذذ کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہی حال ''گلزارِ نسیم'' کا بھی ہے۔ اگرچہ اُردو ادب کی شعری تاریخ میں ہر دو مثنویاں اپنے فضائل کے اعتبار سے بے مثال سرمایہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ متذکرہ مثنویوں کو اگر مقصدیت کے تابع رکھ کر دیکھا جائے تو نتائج مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ارشد محمود ناشاد نے چونکہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں جدید اور مصروف طرزِ زندگی کے حامل قارئین سے مخاطب کیا ہے لہٰذا اس مثنوی میں اختصار اور مقصدیت ہر دو کا رس رچاؤ شامل ہے۔ یہ صرف ایک تنِ مردہ میں روح پھونکنا نہیں ہے بلکہ تنِ مردہ میں روحِ جدید و مفید ڈالنا ہے۔ اس اعتبار سے اس کاوش کی افادیت، قبولیت، مقصدیت، اسلوب، رعایتِ لفظی، افکارِ جدیدہ، سب، زمانۂ حال کے قاری کے لیے ہیں۔ لہٰذا اس سے بھرپور استفادہ ممکن ہے

اور یہی وہ واحد سبب ہے جو اسے دیگر مثنویوں میں ایک جداگانہ مقام دلاتا ہے۔ کتاب دوستی کی روایت کو از سرِ نو زندہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بجا طور پہ کہا ہے کہ:

''کتاب سے گریز پائی اور بے گانگی روز بہ روز بڑھنے لگتی ہے۔ طلبہ، اساتذہ اور عام افرادِ معاشرہ سب اِس کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ تعلیمی اداراوں، مدارس و مکاتب، کتب خانوں اور گھروں کا ماحول بدلنے لگا ہے۔ جدید سائنسی آلات کے استعمال کا جون نئی نسلوں کو اپنے تہذیبی اور علمی ورثے سے دُور کرتا جاتا ہے۔ ان حالات میں لازم ہے کہ مٹتے ہوئے کتاب کلچر کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن سعی کی جائے۔''(۱۳)

خواہش کے درجے میں ایک بات پیش کی جاتی ہے کہ اس مثنوی کو شاملِ نصاب کیا جائے اور اس نوع کے مزید تجربات دیگر اصناف نظم و نثر میں کیے جائیں جن میں موضوع کا انتخاب بھی بامقصد ہو تو شاید ادب میں ایک نئے دبستان کے خوش گوار آغاز کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔

حواشی

(۱) علامہ اقبال، ہمالہ مشمولہ بانگِ درا، مطبوعات شیخ غلام علی، لاہور، اشاعت پنجم، ۱۹۸۵ء، ص ۷۔

(۲) انتخاب کلام مومن، (مرتبہ) منور ہاشمی، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۸۱۱۔

(۳) المنجد العلام، (مرتبہ) محمود الحسن ساغر، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۸۱۵۔

(۴) کتاب نامہ، ارشد محمود ناشاد، سرمد اکادمی، اٹک، ۲۰۱۶ء، ص ۲۲۔

(۵) علامہ اقبال، مشمولہ بالِ جبریل، مطبوعات شیخ غلام علی، لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۸۳ء، ص ۲۔

(۶) میر درد (خواجہ)، کلیات میر درد، مجلس ترقی ادب، مرتبہ خلیل الرحمٰن داودی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۶۹۱۔

(۷) کتاب نامہ، ارشد محمود ناشاد، سرمد اکادمی، اٹک، ۲۰۱۶ء، ص ۴۲۔

(۸) ایضاً، ص ۹۲۔

(۹) ایضاً، ص ۶۴۔

(۱۰) علامہ اقبال، مشمولہ، مطبوعات شیخ غلام علی، لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۸۳ء، ص۔

(۱۱) کتاب نامہ، ارشد محمود ناشاد، سرمد اکادمی، اٹک، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۔

(۱۲) ایضاً۔ ص ۴۶

(۱۳) ارشد محمود ناشاد (ڈاکٹر)، طلوع مشمولہ کتاب نامہ، ایضاً، ص ۷۔

☆☆☆☆☆☆

عباس تابش کے بہتر نشتر

عباس تابش کا شمار عہدِ حاضر کے ان شعراء میں ہوتا ہے، جنہیں اپنا زمانہ بہ چشمِ خود دیکھنے کا موقع میسر آیا اور خواص وعوام میں بھرپور پذیرائی نصیب ہوئی۔ ان کے عہد کے متعدد شعرا عارضی شہرت سمیٹ کر ماضی کا حصہ بن چکے ہیں یا اسی شہرت کو گھسیٹ رہے ہیں لیکن عباس تابش کے فن کی چمک دمک میں رتی بھر بھی کمی واقع نہیں ہوئی اور وہ کامیابی سے اپنی شاعرانہ فتوحات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عباس تابش سخن گو بھی ہیں اور سخن شناس بھی، مطالعے کی وسعت اور مسلسل فنی ریاضت سے اچھوتے موضوعات اور شعری اظہار پر ان کی گرفت مضبوط اور حیران کن ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ غزل کے مروجہ پیمانوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی نئی بات اور نئے امکانات کے دریچے وا کیے جا سکتے ہیں۔ تخیل کی زرخیزی اور مصرع سازی کے ہنر نے ان کے فن کی جاذبیت کو فزوں تر کر دیا ہے۔ نامانوس اور مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے وہ موزوں اور عام فہم الفاظ سے شاعری کو ساحری بنا دیتے ہیں۔ مشاعروں میں مقبولیت کے پہلو بہ پہلو تابش کی غزل کاغذ پر زندہ رہنے کی بھرپور کیفیت، توانائی اور رعنائی رکھتی ہے۔ انہیں تندیء بادِ مخالف کا سامنا رہا اور ہے لیکن شاعری کے ساتھ کمٹمنٹ، شعور اور تخلیقی وفور نے ان کی پرواز میں کوتاہی نہیں آنے دی۔

عباس تابش کی خوش قسمتی جب انہیں میلسی سے لاہور لائی تو ادب شناسوں کا ایسا حلقہ میسر آیا، جس نے شاعری کو عباس تابش کا

بدر منیر

مسئلہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ معروف شاعر خالد احمد کی قربت اور راہنمائی نے تابش کے فکر و فن کو بہت جلا بخشی اور احمد ندیم قاسمی کے موقر ادبی جریدے ''فنون'' میں ان کی شاعری اشاعت پذیر ہو کر اپنا اعتبار اور وقار بنانے لگی۔ ۱۹۸۶ میں جب وہ جی سی یو لاہور میں ایم اے اردو میں داخل ہوئے تو ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تمہید'' چھپ چکا تھا۔ تابش کے ساتھ گزارے ہوئے وقت میں یہ تو واضح ہو گیا کہ شاعری کرنا ان کے نزدیک سانس لینے کے مترادف ہے۔ وہ ہر وقت کسی شعر کسی غزل کی آمد کا شدت سے منتظر رہتے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے رومان پرور ماحول میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''آسمان'' منظرِ عام پر آیا۔ جس کے آغاز میں عباس تابش کی تحریر ''سخن سرائے سے ایک خط'' خوبصورت اور گہری معنویت کی حامل ہے۔ اس زمانے میں وہ شعر بھی تخلیق ہوا، جو ان کی پہچان بنا اور جی سی لاہور کے در و دیوار میں گونجا۔

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

.....

یہ وہ زمانہ تھا جب عباس تابش کا فن شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہا تھا۔ کلاسیکی اور معاصر ادب کے مطالعہ کے علاوہ تجربات اور مشاہدات سے انہوں نے بہت کچھ کشید کیا۔ نتیجتاً ان کی شاعری کا ہر آنے والا دن گذشتہ سے بہتر ہوتا گیا۔ لاکھوں دفعہ برتے ہوئے الفاظ ان کے اشعار کا حصہ بن کر نئے طرزِ احساس کی نمائندگی کرنے لگے۔ آسمان کے بعد ان کے شعری مجموعے مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، پروں میں شام ڈھلتی ہے، رقصِ درویش اور شجر تسبیح کرتے ہیں، اشاعت پذیر ہو کر چاہنے اور سراہنے والوں کا حلقہ وسیع کرتے گئے۔ ''عشق آباد'' کے نام سے ان کے کلیات کے بھی کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ شاعری کے اسرار و رموز پر گہری نظر ہونے کے باعث ان کی غزل کا کینوس بہت وسیع اور پر ثروت ہوتا گیا۔ انہوں نے معاملاتِ عشق کو نئے نئے زاویے عطا کرنے کے عمل میں اداسی اور دکھ کو امید افزا چہرہ عطا کیا ہے۔ تابش کے کئی معاصر شعراء تخلیقی طور پر تھکن کا شکار ہو چکے ہیں لیکن تابش بڑے گلوکاروں کی طرح ریاضت کر کے آج بھی تازہ دم ہے، جس کا ثبوت گذشتہ تین دہائیوں میں تخلیق ہونے والی بے پناہ شاعری ہے، جو عوامی مقبولیت کے پہلو بہ پہلو اہم شعرا اور ناقدینِ ادب کی نظر میں معتبر ٹھہری۔ بقول

افتخار عارف "عباس تابش اردو غزل کی روایت کو ثروت مند بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیکی روایت کے دائروں میں رہتے ہوئے مضمون تازہ کی نئی راہیں نکالتا ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف گامزن ہے۔۔۔اکیسویں صدی کی غزل کو وقار و اعتبار بخشنے والوں کا جب بھی ذکر ہو گا، عباس تابش کا نام نمایاں نظر آئے گا۔"

معروف محقق اور نقاد خواجہ محمد زکریا عباس تابش کے تخلیقی عمل کے حوالے سے لکھتے ہیں۔"وہ خیالات کو ذاتی طور پر محسوس کر کے شعر کا جامہ پہناتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں قدیم اور جدید شعرا کے خیالات کی تکرار کہیں موجود نہیں۔ان کے ہاں انفرادیت اور تازہ کاری جگہ جگہ موجود ہے۔چنانچہ ان کا کلام گہرے تاثر کا حامل ہے اور گزشتہ چند دہائیوں سے جو شاعری تخلیق ہو رہی ہے، اس میں عباس تابش کا مقام بہت بلند ہے۔"

عباس تابش استدلال سے اپنے اشعار کو جمال بخشتے ہیں اور سامعین پر ایک کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔وہ جس بحر میں بھی طبع آزمائی کریں وہ مکمل طور پر ان کی گرفت میں ہوتی ہے۔ ہر شعر کے پہلے مصرعے سے وہ ماحول بناتے ہیں کہ دوسرا مصرع سننے کی طلب شدید ہو جاتی ہے۔تابش نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر ایک دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے مصرعے میں اس کی دلیل پیش کرتا ہے۔اس اصول کو تابش کی شاعری پر منطبق کیا جائے تو ان کی شاعری کی جاذبیت اور کشش کا زار سامنے آجاتا ہے۔پہلے مصرعے میں تھیسس بیان کر کے دوسرے مصرعے میں anti. یا pro. thesis لا کر بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔اس سارے عمل میں وہ تہذیبی جمال کے قریہ جانفزا سے باہر نہیں نکلتے۔یہی نفسیاتی چابک دستی ان کے اشعار کو بھرپور تاثر کا حامل بنا دیتی ہے اور سننے یا پڑھنے والوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

.....

عباس تابش اپنے احساس اور فکر کو کبھی منفی تاثر کا حامل نہیں ہونے دیتے، ان کی شاعری زندگی کے بیم و رجا کے مابین حسنِ توازن کی بہترین مثال ہے۔ان کا کلام اپنے عہد سے

مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ لحہ آئندہ کے امکانات بھی روشن کرتا ہے اور صاحبانِ ذوق کے لیے سرمستی اور سرخوشی کا باعث بنتا ہے۔ تابش ہر شعر کے دو مصرعوں میں اپنی بات بلاکم وکاست مکمل کر دیتے ہیں اور کچھ غیر ضروری بھی نہیں ہوتا ورنہ بہت دفعہ یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ شاعر ایک مصرعے میں بات مکمل کر لیتا ہے اور دوسرا مصرع شعر پورا کرنے کے لیے کہتا ہے۔ تابش کا کلام اس نقص سے پاک ہے۔ یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں کہ بہت سے شعراء کی شہرت کا دارو مدار ایک آدھ شعر یا غزل پر ہوتا ہے، جسے وہ ہر مشاعرے میں سنا کر اپنا بھرم قائم رکھتے ہیں۔ عباس تابش کا معاملہ یکسر مختلف ہے، ان کے بہت سے اشعار اور پوری پوری غزلیں زبان زد خاص وعوام ہو کر دوام پا چکی ہیں۔ مضمون آفرینی اور اسلوبیاتی سحر ایک خیال انگیز اور عطر بیز فضا میں لے جاتا ہے۔ وہ کسی عام سے خیال کو بھی اپنے تخلیقی ہنر کا لمس دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ان کا ایک شعر دیکھیے

دوست سب سے کہاں کھنچتا ہے غزل کا چلہ
ہجرۂ میر میں ہوتا ہے سدا ایک ہی شخص

.....

ہجرۂ میر دراصل ہجرۂ غزل ہے، جس کا چلہ

عباس تابش نے کھینچا اور رب اظہار نے ملکِ سخن کی معتبر شہریت اسے عطا کر دی۔ تابش کے کلام کی معقولیت اور مقبولیت دونوں مسلم ہیں، ان کے زیادہ تر اشعار سہلِ ممتنع کے زمرے میں آتے ہیں۔ خیالات کی رفعت، نرمی اور تازگی نے ان کی غزل کو وہ چھب عطا کی ہے جو دلوں میں اترتی اور روحوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ لسانی اور موضوعاتی تنوع نے انہیں ایک باکمال اور روح جان ساز شاعر بنا دیا ہے۔ جتنی شہرت اور مقبولیت ان کے حصے میں آئی وہ قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔ محمد اظہار الحق ''رقصِ درویش'' کے دیباچے ''اقلیم ولائتیں اور سرخ خیمہ'' کے آخر میں لکھتے ہیں۔ ''یہ جو میں نے چند شعر پیش کیے ہیں تازہ شعری مجموعے ''رقصِ درویش'' سے ہیں، ورنہ اگر عباس تابش کے سارے مجموعوں سے نشتر نکالے جائیں تو بہتر سے کیا کم ہوں گے۔''

محمد اظہار الحق کے جملے نے میرے شوق کو مہمیز لگائی اور میں نے عباس تابش کے کلام سے بہتر نشتر منتخب کیے، جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، اس وضاحت کے ساتھ کہ ان کے شعری اثاثے میں اچھے اشعار کی تعداد بہتر سے کہیں زیادہ ہے:

سکوتِ دہر رگوں میں اتر گیا ہوتا
اگر میں شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا

تجھے قریب سمجھتے تھے گھر میں بیٹھے ہوئے
تری تلاش میں نکلے تو شہر پھیل گیا

میرے سینے سے ذرا کان لگا کر دیکھو
سانس چلتی ہے کہ زنجیر زنی ہوتی ہے

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

تو جو ہر بات پہ دیتا ہے پرندوں کی مثال
اس کا مطلب ہے ترے شہر سے ہجرت کیجے

تمہارے ساتھ مسائل پہ گفتگو کیا ہو
کہ میں تو خود سے بھی ترکِ کلام کر بیٹھا

ہم کو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

ہم تو اس رزم گہِ وقت میں رہتے ہیں جہاں
ہاتھ کٹ جائیں تو دانتوں سے علم اٹھتے ہیں

مری خندق میں اس کے قرب کی قندیل روشن ہے
مرے دشمن سے کہہ دینا میں اس سے پیار کرتا ہوں

ٹوٹے گا نہیں دشت نوردی کا تسلسل
رک جائیں گے ہم لوگ تو اشجار چلیں گے

تو پھر یوں ہے کہ میں نے اس کو چاہا ہی نہیں تابش
اگر اس کی شباہت کا گماں مجھ پر نہیں ہوتا

اک اور ہاتھ بھی ہے پسِ رقصِ حیلہ جو
ہم تم تو پتلیاں ہیں تماشا کسی کا ہے

اس کا مطلب ہے یہاں اب کوئی آئے گا ضرور
دم نکلنا چاہتا ہے خیر مقدم کے لیے

اب کون سیرِ ماہ کرے رات رات بھر
ہر خانماں خراب کو گھر دے دیا گیا

تیرے لیے چراغ دھرے تھے منڈیر پر
تو بھی اگر ہوا کی مثال آ گیا تو بس

یوں تھوک نہ مجھ پر مرے ہارے ہوئے دشمن
یہ میری کماں ہے، یہ مرے تیر پڑے ہیں

اس قدر شفاف کر دے گی یہ تنہائی مجھے
دیکھنے والوں کو تو مجھ میں نظر آ جائے گا

جھونکے کے ساتھ چھت گئی، دستک کے ساتھ در گیا
تازہ ہوا کے شوق میں میرا تو سارا گھر گیا

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

تلاشِ رزق میں بھٹکے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانا کھلایا کرتا تھا

میں ہوں اس شہر میں تاخیر سے آیا ہوا شخص
مجھ کو اک اور زمانے میں بڑی دیر لگی

میں اس لیے بھی پرندوں سے دور بھاگتا ہوں
کہ ان میں رہ کے مرے پر نکلنے لگتے ہیں

پھر اس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے

ہم جسے عشق میں دیتے ہیں خدا کا منصب
پہلے پہلے ہمیں لوگوں کی طرح ہوتا ہے

حالتِ جنگ میں آداب خور و نوش کہاں
اب تو لقمہ بھی اٹھاتا ہوں میں تلوار کے ساتھ

بچھڑنے والے ترے لیے ایک مشورہ ہے
کبھی ہمارا خیال آئے تو آنے دینا

کارِ دنیا بھی عجب ہے کہ مرے گھر والے
دن نکلتے ہی مری خیر منانے لگ جائیں

مجھے بھی اوروں کی طرح کاغذ ملا ہے لیکن
میں اس سے ناؤ نہیں سمندر بنا رہا ہوں

میری دعا سے اور تیری آمین سے کیا
اس بستی کے لوگ قیامت مانگتے ہیں

یہ جو مجھ پر کسی اپنے کا گماں ہوتا ہے
مجھ کو ایسا نظر آنے میں بڑی دیر لگی

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم ترے شہر سے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں

پھر اس کے بعد یہ بازار دل نہیں لگنا
خرید لیجیے صاحب غلام آخری ہے

ہمارے جیسے وہاں کس شمار میں ہوں گے
کہ جس قطار میں مجنوں کا نام آخری ہے

کشیدہ کارِ ازل تجھ کو اعتراض تو ہیں
کہیں کہیں سے اگر زندگی رفو کی جائے

میں تو اے عشق تری کوزہ گری جانتا ہوں
تو نے ہم دو کو ملایا تو بنا ایک ہی شخص

کھینچ لاتی ہے ہمیں تیری محبت ورنہ
آخری بار کئی بار ملے ہیں تجھ سے

دل میں ہوتا تو یہ ممکن تھا نکل بھی جاتا
اب تو وہ شخص بہت دور تلک ہے مجھ میں

کب تمھیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے

یہ گردبادِ جہاں کیوں ہمیں گھسیٹتا ہے
کہ ہم تو رقص ترے ساتھ کرنا چاہتے ہیں

تجھ سے نہیں ملا تھا مگر چاہتا تھا میں
تو ہمسفر ہو اور کہیں کا سفر نہ ہو

عجیب لوگ ہیں یہ خاندانِ عشق کے لوگ
کہ ہوتے جاتے ہیں قتل اور کم نہیں ہوتے

ضروریات جہاں ہم سے پوچھنے والے
تجھے یہ کیسے بتائیں کہ تو ضروری ہے

یہ جو ہے پھول ہتھیلی پہ اسے پھول نہ جان
میرا دل جسم سے باہر بھی تو ہو سکتا ہے

کیوں نہ ہو آپ سے مشروط ہمارا ہونا
ہم دعا والے ہیں اور آپ اثر والے ہیں

اس زمانے میں غنیمت ہے غنیمت ہے میاں
کوئی باہر سے بھی درویش اگر لگتا ہے

ایسے نہیں مانوں گا میں ہستی کا توازن
تقطیع کیا جائے یہ مصرعہ مرے آگے

یہ دشتِ قیس کہ اب خاص کر کسی کا نہیں
یہ فیضِ عشق علیہ السلام میرا ہے

اک مقام ایسا بھی آیا مرے بچھڑے ہوئے دوست
میں نے تجھ کو بھی اداسی میں خلل جانا ہے

یہ جو مٹی کی طرح ہم کو بٹھا دیتا ہے تو
موسمِ گریہ ! ترا یہ سلسلہ قائم رہے

اس مدت سے کوئی قیس نہیں ملتا تھا
میرے دروازے پہ صحرا کو ضرورت لائی

کہاں کہاں سے سے چھڑاؤ گے اپنی جان میاں
کہ میرا ایک تعلق نہیں جناب کے ساتھ

جو تو نہیں ہے تو اس کو پکارتے ہیں ہم
ہمارے شہر میں اک شخص تیرے نام کا ہے

کس طرح ترکِ تعلق کا میں سوچوں تابش
ہاتھ کو کاٹنا پڑتا ہے چھڑانے کے لیے

میں اسے دیکھ کے لوٹا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
شہر کا شہر مجھے دیکھنے آیا ہوا ہے

ہم اس لیے بھی تجھے بولنے سے روکتے ہیں
تو چپ رہے تو زیادہ سنائی دیتا ہے

یہ کوئی پھول نہیں ہے کہ شاخ پر آئے
میاں یہ ہجر ہے رخسار پر نمو کرے گا

خوں بہا تو خیر کیا ملتا تمہارے شہر میں
قاتلوں کے نام پر رکھے گئے سڑکوں کے نام

عدالت سے بری ہونا بری ہونا نہیں ہوتا
کہ معافی مل بھی جائے تو پشیمانی نہیں جاتی

تو خدا ہونے کی کوشش تو کرے گا لیکن
ہم تجھے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے

وہ جس کے خوف سے چھوڑا تھا میں نے بستی کو
وہ سانپ پھر مرے سامان سے نکل آیا

کھلے ہیں پھول بھی حجت تمام کرنے کو
تمہارے بعد کوئی مسکرانے والا نہیں

یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے

اگر کبھی مجھے موجودگاں سے فرصت ہو
تو رفتگاں مری نیندیں حرام کرتے ہیں

میں اس کا لمحہ، موجود ہوں مگر وہ شخص
فضول وقت سمجھ کر گزارتا ہے مجھے

ایسے تو کوئی ترکِ سکونت نہیں کرتا
ہجرت وہی کرتا ہے جو بیعت نہیں کرتا

نہ جانے کون مرا کھو گیا ہے مٹی میں
زمیں کریدتی رہتی ہیں انگلیاں میری

فیصلے تاریخ کے میدان میں ہوتے نہیں
مارنے والو! کوئی تم کو نہ مر کر مار دے

یہ ترے بعد جو لیتا ہوں میں لمبی سانسیں
مجھ کو یہ جانتا ہے جسم میں جاں ہے کہ نہیں

مانتا ہوں کہ مجھے عشق نہیں ہے تجھ سے
لیکن اس وہم سے اب کون نکالے مجھ کو

اب اس لیے بھی ہمیں محبت کو طول دینا پڑے گا تابش
کسی نے پوچھا تو کیا کہیں گے کہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے

☆☆☆☆☆

افضل خان ..... ایک بے مثال شاعر

مجھے بہاولپور پر فخر ہے۔ روہی میرے لیے وجہِ افتخار ہے۔ خواجہ غلام فرید میرے لیے فکری تحرک کا بے پناہ سرمایہ ہیں۔ ظہور نظر شاعری میں جمالیاتی ادراک کا استعارہ ہیں۔ سید آلِ احمد تخیل کی گہرائی کے تشخص' انفرادی خال وخد سے تراشے ہوئے حروف اور سب سے ہٹ کر ایک عجیب شانِ بے نیازی کے حُسن میں ڈھلی ہوئی شناخت کی علامت ہیں۔ اور افضل خان پر اس لیے ناز ہے کہ میرے سامنے ادب کی تیسری نسل ریگ زار میں بارش اور روئیدگی کی نوید سنا رہی ہے۔

مجھے وضاحت کرنے دیجیے۔ پہلی نسل وہ تھی جس میں شہاب دہلوی' علی احمد رفعت' حیات میرٹھی' انیس قمر' خلیق ملتانی' عابد صدیق' مرزا نعیم اختر' مجید تمنا' عزیز وطنی' سہیل اختر' تابش الوری' عزیز اکرم' نصر اللہ ناصر' نقوی احمد پوری' عیش شاہجہان پوری' ریاض رحمانی' جانباز جتوئی' فیض محمد دلچسپ' سفیر لاشاری' محی الدین شان' عبدالحق شوق' پیکر واسطی' انعام اسعدی' آسی خان پوری' عبدالعزیز اختر' ظہور نظر اور سید آل احمد شامل ہیں۔

دوسری نسل وہ ہے جس میں منور جمیل' نواز کاوش' منظور شاد' طاہر محمود' سرور ناز' شہزاد سلیم' نوشی گیلانی' خورشید ناظر' قیوم سرکش اور آپ کا یہ نیاز مند شامل ہے۔

تیسری نسل اس وقت ہمارے روبرو سینہ تانے' ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر شاعری کے حسن کو دوچند کر رہی ہے۔ اور اس نسل میں افضل خان' اظہر فراغ' احتشام سعید سلطان' ذیشان اطہر' عاطف نصیر' شگفتہ الطاف اور صالحہ ظفر کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مجھے آپ سے یہ معذرت ضرور کرنی ہے کہ اگر کوئی نام بھول گیا ہوں تو اس کا سبب بد دیانتی بالکل نہیں ہے۔

میں نے افضل خان کو ''اک عمر کی مہلت'' کے حوالے سے جانا اور پہچانا ہے۔ افضل خان کی شاعری میں بہاول پور کی مستحکم ادبی روایت کو آگے بڑھانے کا عزم صمیم اور جاندار شاعری کے ورثہ کو اپنا رہنما بنا کر شعری روایت کو زندہ جاوید اور امر کرنے کا ہنر ملتا ہے۔

افضل خان باغی نہیں ہے مگر اُس کی اپنی ڈکشن ہے، اپنی سوچ ہے، اپنا تخیل ہے، اپنی اور جینٹلی ہے۔ اس کی شاعری روایت پر استوار ہو کر عظمتوں کے نئے افق چھو رہی ہے۔ افضل خان کی شاعری میں کتنے زمانے ضو ریز ہو رہے ہیں۔ وہ کہیں کہیں یاس یگانہ چنگیزی کے لہجے میں احساس تفاخر سے دوچار ہے:

نیاز لکھویرا

اپنے نام کے پیمانے سے ناپ نہیں اپنے قد کو
لوگ تو اس میدان میں افضل ہوتے ہوتے ہوتے ہیں

.....

اور کہیں وہ منیر نیازی کے فلسفہ شعر کو کھوجتا ہوا معلوم سے نامعلوم کے سفر پر گامزن ہے۔

پائے گا کون بھلا تیرے سوا راز ترا
جب کہ معلوم نہیں نقطۂ آغاز ترا

.....

نکل پڑا تھا جنوں کے بہاؤ میں گھر سے
اور اب یہ سوچ رہا ہوں کدھر چلا جائے

.....

خود بڑھ کے دیکھ آؤں کہ گھر لوٹ جاؤں میں
رستے میں یہ کھلا ہے کہ بازار بند ہے

.....

افضل خان، اقبال کے زمانے کی مسافتیں بھی طے کر رہا ہے۔ عشق اور عقل کی گتھی ہے کہ سلجھ ہی نہیں رہی:

دل کے جذبات الگ، عقل کی اوقات الگ
عشق کی راہ مگر یوں ہے نہ یوں ہے، یوں ہے

.....

عشق کا سب سے کٹھن مرحلہ کربلا کی صورت میں ہمارے ادب کو جگمگا رہا ہے۔

کربلا ایک ایسا مکمل استعارہ ہے جس کے بغیر ادب ادھورا اور اس کی تشریح و معانی بے خواب جھروکوں کی طرح اجاڑ اور ویران نظر آتے ہیں۔

افضل خان نے کربل کا زمانہ بھی دیکھا ہے:

میں پہلے کوفہ گیا اس کے بعد مصر گیا
ادھر برائے شہادت اُدھر برائے فروخت

.....

اب اس لڑائی میں ممکن ہے سر چلا جائے
جسے بھی جان ہو پیاری وہ گھر چلا جائے

افضل خان کئی زمانوں کا شاعر ہے اور اس میں اس کا اپنا زمانہ بھی شامل ہے:

دالان میں سبزہ ہے نہ تالاب میں پانی
کیوں کوئی پرندہ مری دیوار پہ اترے

.....

غزل کو کم نگاہوں کی پہنچ سے دور رکھتا ہوں
مجھے بنجر دماغوں میں شجر کاری نہیں کرنی

.....

ختم ہوئی آخر بے خوابی دریا میں
ڈوب گئی ہے اک مرغابی دریا میں

.....

شجر سے میرا تعلق ہے شام ہونے تک
سرک رہا ہوں مسلسل سرکتی چھاؤں کے ساتھ

.....

بچھڑنے کا ارادہ ہے تو مجھ سے مشورہ کر لو
محبت میں کوئی بھی فیصلہ ذاتی نہیں ہوتا

.....

ہر ایک چشمِ دیدہ ور یہاں خرید لی گئی
جو کور چشم تھا اسے تھما دیا گیا دیا

.....

تجھ کو راس آئے گا میرا پسِ پردہ ہونا
میرے مرنے سے پڑے گی ترے کردار میں جان

.....

جتنے بھی زمانے ہیں ان میں سب سے زیادہ جاندار اور توانا وہ زمانہ ہے جو افضل خان نے بسر کیا ہے، صرف اور صرف اپنے لیے۔ اس کی شاعری بہت سی جہتوں کی نوید دے رہی ہے اور ان میں ایک جہت بڑی شاعری کی ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب دوستی

کتاب دوست معاشرے منفرد معاشرے ہوا کرتے ہیں۔ کتابیں نہ صرف لکھنے والوں کو ممتاز کرتی ہیں بلکہ پڑھنے والوں کو بھی منفرد بناتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک دور تھا، بہت شاندار کتابیں لکھی گئیں۔ لوگ آج بھی مختار مسعود، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، عبداللہ حسین، قدرت اللہ شہاب کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں۔ والدین بچوں کو لائبریریوں میں لے جایا کرتے تھے، بچے کتابیں ایشو کراتے، دوستوں، اساتذہ اور والدین سے علمی وفکری تبادلہ خیال ہوتا۔ یوں روشن راہیں کھلتی چلی جاتیں۔ آج کا دور کتاب کے حوالے سے ایک مشکل دور ہے، بچوں کے ہاتھوں میں کتاب کے بجائے سمارٹ فون آ گیا ہے اور بچے خود کو فون کے بل بوتے پر ہی سمارٹ گردانتے ہیں۔ وقت کا ضیاع الگ تو اخلاقی اقدار کی پامالی الگ۔ مغرب جس نے سمارٹ فون متعارف کرایا اس نے نئی نسل کے ہاتھوں سے کتاب نہیں گرنے دی لیکن ہمارے ہاں معاملہ مختلف ہے۔

ان حالات میں ملک میں کتاب کلچر کو پروموٹ کرنا یقیناً کسی مشن سے کم نہیں ہے اور وہ لوگ جو اس کام کے ساتھ منسلک ہیں یقیناً قابلِ صد تحسین ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف کتابوں تک رسائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر جانفشانی اور محبت سے کتابوں کی اشاعت جاری ہے۔ چند روز قبل قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے چیئرمین علامہ عبدالستار عاصم نے چند کتابیں بھجوائیں۔ ان میں ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کی عمرِ رواں، ڈاکٹر اے آر خالد کی کالموں پر مبنی کتب، وی فار وکٹری اور 'حل' جبکہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی 'طلب کے لمحے' شامل تھیں۔ عمرِ رواں ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کی خودنوشت ہے۔ انہوں نے بے لاگ انداز میں کتاب میں ملک کے سیاسی، معاشی اور علمی حالات کے ساتھ جمہوریت' آمریت اور اُس جدوجہد کا ذکر بھی کیا ہے جو ملک سے محبت کرنے والوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یقیناً جو لوگ ملک میں بہتری کے لئے اپنا کردار ادا کرتے ہیں وہ ایسی

یوسف عالمگیرین

قندیل روشن کرتے ہیں جس کے ثمرات آئندہ نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ یوں عمرِ رواں صرف ڈاکٹر فرید پراچہ کی خودنوشت ہی نہیں بلکہ ان حالات وواقعات کا آئینہ بھی ہے جس سے یہ دھرتی گزرتی چلی آئی ہے۔

کالموں پر مبنی ڈاکٹر اے آر خالد کی کتابیں منفرد حوالہ رکھتی ہیں کہ جس جرأت اور بے باکی کے ساتھ وہ ہر دور کی حکومتوں کے حوالے سے لکھتے چلے آئے ہیں ہم اس کے چشم دید گواہ ہیں کہ 1990 میں جب ہم پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے صحافت کر رہے تھے تب وہ ہمارے فیورٹ اساتذہ میں سے تھے۔ یوں ان کی صحافتی میدان میں بے باکیوں سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ان کا کام اور صحافت کی ترویج میں کردار ہمیشہ زندہ رہے گا۔

''طلب کے لمحے'' ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی کتاب ہے جو مشاہیر کے دورِ طالب علمی کا احوال ہے۔ انہوں نے سرسید احمد خان، الطاف حُسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح، محمد علی جوہر، عبیداللہ سندھی، حسرت موہانی، ظفر علی خان، چودھری افضل حق اور احسان دانش کے دورِ طالب علمی کے حوالے سے قلم اٹھا کر ایک ایسی تاریخی وعلمی خدمت سرانجام دی ہے جس سے نہ صرف آج کے نوجوان بلکہ ان کے بعد کے آنے والی نسلیں مستفیض ہوتی رہیں گی کہ انہیں مشاہیر کے بچپن کی عادات و اطوار، تعلیمی اور دیگر سرگرمیوں سے آگاہی ملے گی۔

کچھ عرصہ قبل قلم فاؤنڈیشن ہی کے زیرِ اہتمام معروف دانشور محقق ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب ''سچ تو یہ ہے'' شائع ہوئی۔ یہ کتاب قائداعظم اور تاریخ پاکستان کے حقائق مسخ کرنے والوں کو تاریخی شواہد کی بنا پر مدلل جوابات پر مبنی ہے جو کہ یقیناً ایک بہت بڑی قومی و ملی خدمت ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود جیسے قد کاٹھ کی علمی شخصیات اب خال خال ہیں۔ ان کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے قائداعظم اور تاریخ پاکستان کے حوالے سے تحقیقی بنیاد پر ایسا کام کیا ہے جس کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ لوگوں نے بوجوہ پاکستان کی تاریخ اور حقائق کو مسخ کرنے کی سعی کی جن کا مدلل اور استدلالیت سے جواب دینے کی ضرورت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنا حق ادا کر دیا ہے اور لوگوں کے دلوں میں جنم لینے والے وسواس وخدشات کو دور کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔

ممتاز شاعر، ادیب، کالم نگار، ایڈیٹر جبار مرزا بھی ملک کی اُن شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے کتاب کو پروموٹ کرنے میں ہمیشہ عملی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی شاعری، نثر اور سیاسی حوالوں سے متعدد کتب ہیں جو حد درجہ پذیرائی حاصل کر چکی ہیں ان کا ناول 'پہل اُس نے کی تھی' شائع

ہوا تو وہ وادیٔ عشق کی ایک ایسی تصنیف کے طور پر سامنے آیا جس نے قارئین کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیا۔ اکثر لوگ جہاں جبار مرزا کے ناول کی تعریف کرتے وہاں جبار مرزا کی دلیری کی بھی تعریف کرتے کہ انہوں نے اپنی زوجہ محترمہ شائستہ جبار، رانی صاحبہ کے ہوتے ہوئے اپنی پہلی محبت جس میں بے شک 'پہل اُس نے کی تھی' کا احوال کیسے لکھ لیا۔ کیونکہ کسی محبت بلکہ کسی بھی محبت کا ذکر اپنی بیوی کے سامنے کرنا اچھا خاصہ 'کھرناٹ' آدمی بھی افورڈ نہیں کرتا لیکن جبار مرزا صاحب نے بڑے سکون سے کتاب لکھ کر مارکیٹ بھی کر دی۔ وہ تو ہمیں ''جوٹوٹ کے بکھرا نہیں'' کتاب جو انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ شائستہ جبار جو کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں، کے علاج کے سلسلے میں آنے والی مشکلات اور تجربات کے حوالے سے لکھی ہے، پڑھ کر معلوم ہوا کہ شائستہ جبار صاحبہ نے ''پہل اُس نے کی تھی'' کی اشاعت پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا تھا جس کو مرزا صاحب کسی نہ کسی طرح سے مینج (manage) کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ اس کے پیچھے بھی جناب جبار مرزا اور رانی صاحبہ کی باہمی محبت اور تعلق کام آیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا دم بھرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ 'جوٹوٹ کے بکھرا نہیں' شہریار پبلی کیشنز کے تحت شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر قارئین مخمصے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہل اُس نے کی تھی میں جبار مرزا جس طرح 'چوہدرانی' کا تذکرہ کرتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ محبت اور اپنائیت سے ''جوٹوٹ کے بکھرا نہیں'' میں اہلیہ محترمہ رانی صاحبہ کے لئے دل گرفتہ دکھائی دیتے ہیں، اس میں کئی مقامات پر شائستہ جبار رانی کی محبت، چوہدرانی کی محبت پر غالب دکھائی دیتی ہے۔ جبار مرزا سراپا محبت ہیں یہ تو عام لوگوں اور شاعروں، ادیبوں کی دلجوئی میں پیچھے نہیں رہتے۔ ان کی سپورٹ کرتے ہیں، کام آتے ہیں۔ وہ اپنے خونی رشتوں کی حق تلفی کیونکر کر سکتے ہیں۔ یہ جبار مرزا ہی کا خاصہ ہے وہ لوگوں کے لئے خیر کثیر ہیں۔ ایسے لوگ قدرت کی نگاہ میں ہوتے ہیں اور اس کے خاص بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

گزشتہ دنوں منفرد لب و لہجے کے شاعر اور خوبصورت نثر نگار کرامت بخاری کے حوالے سے دو کتابیں موصول ہوئیں۔ 'خواب ریزے' غزلیات کا مجموعہ جبکہ دوسری کتاب کرامت بخاری (مشاہیر و معاصرین کی نظر میں) توقیر احمد شریفی کی مرتب کردہ ہے۔ کرامت بخاری سول سروسز میں رہے۔ گریڈ بائیس سے ریٹائر ہوئے۔ سروس کے دوران اور سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان میں عاجزی اور انکساری دکھائی دی۔ انہوں نے اپنے عہدے اور گریڈ کو زندگی بھر

دوستوں کے ساتھ تعلق میں حائل نہیں ہونے دیا۔ مروت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار ان کا خاصہ رہی ہیں۔ چھوٹی بحر میں کہی گئی ان کی غزلیں اور منفرد اسلوب کی حامل نظمیں ادب کی دنیا میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ان پر مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام بھی ہو چکا ہے۔ ملک کے مختلف ادبی اداروں میں ایسے لوگوں کو تعینات کر کے اُن کے تجربات اور علم سے فائدہ اٹھایا جانا چاہئے۔ جن معاشروں میں انصاف اور شفافیت ہوتی ہے وہاں لوگ میرٹ پر تلاش کیے جاتے ہیں اور اُن سے کام لیا جاتا ہے۔ 'خواب ریزے' کرامت بخاری کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ افتخار عارف لکھتے ہیں'' کرامت بخاری اپنی زندگی میں، اپنی شخصیت اور اپنے لفظ میں ایک ارتباط معنوی کے مستحکم کرنے میں منہمک شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ سیف، عدم، ناصر، جون، اور انور شعور کے بعد آنے والی نسل میں کرامت بخاری شائد سب سے نمایاں تخلیق کار ہیں جنہیں اس قبیلے میں دیکھا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم سرگودھا میں ہوتے ہیں ماہر تعلیم ہیں، شاعر، نثر نگار اور اعلیٰ پائے کے محقق ہیں۔ ماہر امور اقبال ہیں۔ علامہ اقبال کے علمی و فکری پہلوؤں پر اُن کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ حکمتِ بالغہ میں اقبال شناسی، شانِ اقبال، کلام اقبال میں ممتاز شخصیات، کلام اقبال میں مقامات سمیت متعدد کتب منظر عام پر آ کر قبولیت کی سند پا چکی ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے تحقیق کے میدان میں تنِ تنہا اتنا کام کیا ہے کہ بعض ادارے بھی اتنا کام نہیں کر سکے۔ تحقیقی میدان میں ان کی تصانیف ریفرنس بک کے طور پر ہمیشہ کارآمد رہیں گی اور آئندہ ریسرچ کرنے والوں کے کام آئیں گی۔

سمیع اللہ خان بھی نوجوان دانشور ہیں جو پاکستان ادب پبلشرز کے تحت اردو اور انگریزی میں بہت خوبصورت کتب شائع کر رہے ہیں۔ ان کا کام دیکھ کر یہ اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت اور ترویج کے حوالے سے پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے۔

ریاض احمد چودھری ڈائریکٹر بزم اقبال ہیں، جب سے انہیں یہ ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں اقبال شناسی سے متعلق کتابوں کی اشاعت میں تواتر دکھائی دے رہا ہے۔ حال ہی میں حیات اقبال کے نام سے ایک کتاب انہوں نے تالیف کی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک بڑی خدمت ہے۔ قوم، ملت اور قومی مشاہیر کے حوالے سے کتب کی یقیناً ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ خدا کرے وہ اسی طرح اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔ ایسی کتب کی اشاعت ہماری قوم کے لئے کسی اثاثے سے کم نہیں کہ یہ کتب انہیں اپنی تاریخ اور مقاصد سے روشناس کراتی ہیں اور اپنے مقصد اور نظریے سے جڑی رہنے والی اقوام ہی زندہ اور ثابت قدم رہتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

"فلسفہ و رومان کا ادراکی شاعر"

اگر اردو ادب کے کل سرمائے کی تقسیم کی جائے تو اس کی دو واضح اقسام، اردو نثر اور نظم سامنے آتی ہیں یعنی نثر کے علاوہ ادب کا تمام تر اثاثہ نظم کے زمرے میں ہی آتا ہے لیکن نظم کی مختلف اقسام یا عنوان جیسے غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی، آزاد نظم، نظمِ معریٰ اور نثری نظم وغیرہ اپنی اپنی الگ شناخت بھی رکھتی ہیں۔

کوئی بھی شاعر جب اپنے جذبات و احساسات کو لبادہ لفظ و حرف عطا کر کے کسی ادبی سانچے میں ڈھالتا ہے تو اسے شاعری کہا جاتا ہے لیکن یہ ہرگز ضروری نہیں کہ کوئی شاعر اپنی آپ بیتی کو ہی نوک قلم پر لا کر سپردِ قرطاس کرے بلکہ وہ اپنے گرد و پیش تو کیا ارض و سماوات کا بھی ترجمان ہوتا ہے قدرت اسے تخیل کی ایسی دولت سے مالا مال کرتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ کائناتِ ادب میں اپنی ایک الگ سلطنت قائم کر لیتا ہے اور اپنی دنیا کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق سنوارنے کے جتن کرنے لگتا ہے۔ وہ صاحبِ فرش ہو کر کبھی عرش و افلاک سے ہمکلام ہوتا ہے تو کبھی صحرائے زیست میں دریاؤں کی روانی کا تمنائی دکھائی دیتا ہے وہ تخیل کی آنکھ سے سنگلاخ چٹانوں سے پیڑ پودے اور پھول پتے اگتے دیکھتا ہے اور سوچوں کے ساحل پر گیلی ریت سے سپنوں کے محل تعمیر کرتا ہے اور اپنے قلم کو تیشہ کر کے چٹانوں سے شہکار تراشتہ ہے

شوکت کمال رانا بھی ایک ایسا ہی فنکار ہے جسے قدرت نے تخیل کی دولت سے خوب

ارشد محمود ارشد

نوازا ہے۔ یوں تو شوکت کمال رانا غزل کا بھی عمدہ شاعر ہے مگر جو چاشنی ان کی نظموں میں ہے اس کا اپنا ہی رنگ، ڈھنگ اور ذائقہ ہے۔

کوئی بھی تخلیق کار اپنے عہد سے چشم پوشی نہیں کر سکتا وہ معاشرتی حالات و واقعات، حادثات و المیات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اس سے ادبی رس کشید کر کے فن پارے تخلیق کرتا ہے شوکت کمال رانا بھی ایک حساس دل شاعر ہے تو پھر وہ اپنے گرد و پیش سے کیسے بے خبر رہ سکتا ہے۔

ابتلا کے اس دور میں کرونائی صورت حال نے ہر حساس تخلیق کار کو متاثر کیا اور اس ابتلائی صورت صورت حال سے کئی تخلیق کاروں نے اپنے فن کا رزق حاصل کیا۔ بے شمار مضامین، کالم، نظمیں، غزلیں وغیرہ تخلیق ہوئیں جن میں کرونائی منظر نامے کا عکس جھلکتا ہوا ملتا ہے اسی عکس بندی کے کچھ نمونے شوکت کمال رانا کے کلام میں بھی در آئے ہیں۔ ان کی ایک نظم "وبا کا موسم" اسی تناظر کا شاخسانہ ہے وہ کہتے ہیں۔۔۔

وبا کے دن ہیں
حیات میں اک نیا ہی موسم اتر رہا ہے
جمود کی برف گرتے جمتے
جگر کی وادی سے دل کی چوٹی تلک
لہو کے تمام رستے سفید خلیوں سے بھر گئے ہیں
سرشتِ انسان بے حسی میں
قدیمی رشتوں سے راہ و رسم جہاں نبھاتے
ہوئے جبلت میں بٹ رہی ہے
یہاں تو اعضا ہی کٹ رہے ہیں
دماغ کو در و کی خبر تک نہیں تو کیا؟
نفسا نفسی اعصاب مردہ سارے بنا چکی ہے
اگر یہ سچ ہے تو پھر قیامت میں دیر کیوں ہے

.....

شوکت کمال رانا کی ایک اور نظم "آئینہ تنہائی" میں بھی کرونائی عہد کے جذبات و احساسات مجسم دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہمارے ہاتھوں پہ کون سا میل جم گیا ہے
جسے مٹاتے ہوئے لکیریں
ہمارے ہاتھوں سے مٹ رہی ہیں

.....

ان کی یہ نظم ہمارے گرد و پیش کے موجودہ حالات کی نمائندگی کرتی ہے وہ انسان کی بے بسی پر خود کلامی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گھروں میں تنہا نفوس اپنی
حیات کی جنگ لڑ رہے ہیں
نفوس حیرت سے اپنے پیاروں کی خالی
آنکھوں میں عہد و پیماں تلاشتے ہیں
سوچتے ہیں کس نے
جدائی نسلوں میں بانٹ دی ہے ۔۔۔۔
اور پھر شوکت کمال رانا خود سے کہتے ہیں کہ۔۔۔
وبا میں تنہائی اس لیے ہے
کہ دل سے زنگار سب اُتاریں

لطیف ہو کر ملیں کسی سے
کوئی گلے سے ہمیں لگائے

شوکت کمال رانا کی شاعری زندگی سے ہم آہنگ ہے اور انسانی حیات کے بیشمار رویوں، رومانوی، نفسیاتی، انقلابی، سیاسی، سماجی اور فکری سوچ کو اُجاگر کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں رومان اور فلسفہ دو متوازی دریاؤں کی صورت بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ رومانیت سے بھرپور اُن کی ایک نظم "حُسنِ جہاں تاب" خاصے کی چیز ہے جس میں وہ اپنے محبوب کا پیکر تراشتے ہوئے اس کی خوبیاں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

ترے ہونٹوں کی بند کلیاں
تبسم کی شرارت روکتی ہیں جب
کئی غنچے چٹخنے کی ادا کو بھول جاتے ہیں
ترے گلنار گالوں سے
شفق بامِ سحر پر جب اترتی ہے
پرندے ہم زباں ہو کر
صبا کو خوابِ غفلت سے جگاتے ہیں
گلوں میں رنگ آتے ہیں

اور اسی طرح ان کی ایک نظم "کائناتی لیب" میں فلسفہ حیات رقصاں دکھائی دیتا ہے وہ کہتے ہیں:

چلو ہم فرض کرتے ہیں
جہاں میں زندگی اک حادثاتی کھیل ہے
جس میں
کسی خالق کے تخلیقی مظاہر کی رمق تک بھی نہیں ملتی
کسی اک حادثے کا یہ نتیجہ ہے
یونہی بیجان چیزوں کی ملاوٹ
ارتقا کے کچھ مراحل سے گزر کر
زندگی کے روپ میں آئی ---

اور پھر آخر میں کہتے ہیں کہ ---

اگر ہم علم کا اطلاق بھی کر لیں
تو سائنس یہ بتاتی ہے
کوئی زندہ نفس ہرگز
کسی بیجان سے پیدا نہیں ہوتا
ہمیشہ زندگی سے زندگی تکمیل پاتی ہے
تو ثابت یہ ہوا کہ حادثے سے پیشتر بھی
زندگی موجود تھی

شوکت کمال رانا کی نظموں میں مصرعوں کا بہاؤ ایسا ہے کہ قاری کو کہیں بھی ٹھوکر نہیں لگنے دیتا۔ قاری اُن کی نظموں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تصوراتی جہانوں میں اُترنے لگتا ہے۔

میں شوکت کمال رانا کو ان کے تیسرے شعری مجموعہ کلام "امکان" کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اُن کی شعری کائنات امکانات کا روشن باب ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆

نمرہ وارث کا شعری جہان

ابہام کو شعری قرات کا عیب قرار دینے والے شارحین اور قارئین متن کو کسی لازمی وحدت کی شکل میں دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں جن کے نزدیک شعر کی مختلف پرتیں دریافت کرنے کی کوششیں بھی لغوی یا روایتی طور پر روا استعاراتی معنوں تک پہنچنے کی سعی سے زیادہ نہیں ہوتیں، حالانکہ معنی کا ہالہ لفظ سے جڑت کے باوجود متن کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر موجود ہوتا ہے۔ مثلاً میراجی کی نظم ''کئی ستارے چمک رہے ہیں'' کی تفہیم محض متن کے بیانیے کی اندرونی تعبیر سے پوری نہیں ہوتی، اس کے لیے متن کے بیرونی ماحول کا ادراک بہت ضروری ہے جو بتاتا ہے کہ متکلم اس نظم میں سامع کو صبح کے آنے کی خبر کیوں دے رہا ہے۔ صبح کے آنے کی خبر دراصل ایک دوسرے سے جدا ہونے کی طرف اشارا کرتی ہے کیونکہ معاشرتی رسوم اور قوانین دو متضاد جنس کے افراد کو دن کی روشنی میں بھی اکیلا بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لیے ابہام کا تعلق محض غیر یقینیت سے نہیں بلکہ امکانات کے دائروں سے بھی ہے۔ البتہ ابہام کی درست تفہیم کا تعین قاری کے شعری شعور سے ضرور پابند ہے، ایک اوسط سطح کا قاری جو دو جمع دو چار کا قائل ہو، اس کے لیے ایک ہی متن میں بہت سے مختلف، متضاد اور کثیر معنوں کی موجودگی سے پیدا ہونے والے الجھاؤ کا مطلب امکانات کی موجودگی کے بجائے تخلیق کار کے سلیقہ اظہار میں خامی ہو سکتی ہے لیکن لفظ، معنی اور تعبیر کی مثلث کو گہرائی اور گیرائی، ہر دو حوالوں سے سمجھنے والا قاری ایسے متن سے معنی کے کئی جہان برآمد کرے گا۔

نثری نظم شروع سے ہی ابہام، بے معنویت اور الجھاؤ جیسے سینکڑوں تیکھے الزامات کی زد میں رہی جس کے سبب جہاں بہت سے تخلیق کار نثری نظم کے پیراڈائم سے خائف ہوئے، وہاں بہت سے تخلیق کاروں نے زبردستی مختلف النوع جملوں کے ذخیرے کو ترتیب دے کر اسے نثری نظم قرار دینا شروع کر دیا۔ اس پس منظر میں نثری نظم اور اس کے پورے وجود کو سمجھنے والے نئے تخلیق کار خال خال نظر آتے ہیں جن میں سے ایک ''نمرہ وارث'' بھی ہے۔

نمرہ کی نثری نظموں میں نفسیات، وجودیت، غیریت، جنسی جمالیات اور پس کربیہ/ ناسٹلجیا جیسے تصورات اپنے بہت سے متبادل بیانیوں کے ہمراہ نظر

حمزہ یعقوب

آتے ہیں۔ اس کے ہاں جدید فرد کی تنہائی کا تصور ایک منفرد بیانیے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ تصور اگر نیا نہیں بھی ہے تو روایتی تصورات سے مختلف ضرور ہے۔ مثلاً ایک نظم ''لاشہ'' دیکھیے:

ہر صبح یہ لاشہ، یہ بستر
آنکھیں، جو ہمیشہ کھلی رہتی ہیں
پاؤں، جو ہمیشہ دبے رہتے ہیں
ہونٹ، جو گلے سے ربط کھو چکے ہیں
آواز، جو اسی ربط میں ٹوٹ چکی ہے
دل، جس کا اب کوئی ساز نہیں
ہاتھ، پاؤں اور سر دھنسے ہوئے ہیں
آسماں کے بیچ اور زمین کے بیچ
گور کن آتا نہیں ہے، لاشہ اٹھاتا نہیں ہے
لاشہ پہلے سر، پاؤں اور ہاتھ اٹھاتا ہے
پھر آوازوں کا ربط بناتا ہے
ربط، ربط، آواز اور ساز
کوئی دوست، کرگس یا چیل
کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں آتا
لاشہ خود اٹھ جاتا ہے

.....

اسی طرح کے اکیلے پن کا تصور نمرہ کی ایک اور نظم ''تنہائی'' میں بھی نظر آتا ہے:

اکیلے رہنے سے سرہانے پر سانپ بیٹھ جاتا ہے
دوستیاں ختم ہو جاتی ہیں
اور خلا سات نسلوں کے سینے میں
کسی گونگی ماں کے توسط سے
پھیلتا اور رنگ نچوڑ لیتا ہے
حاملہ عورت، پیلی عورت
گونگی عورت اپنی تنہائی کو آواز کیا دے؟
اپنے ہونے والے خلا کو زبان کیا دے؟
اکیلا رہنا اچھا ہے
مگر شیطان بھی اکیلا ہے
جسے کوئی بھی اعوذ باللہ پڑھ کر بھگا دے
اس کی گردن پر بھی سانپ ہوگا
اسے بھی خلا پر کرنے کے لیے
زمین کے سو سو چکر لگانے پڑیں گے
کبھی کسی کے خدا میں
کبھی کسی کی دعا میں
اب مردود خلا میں واپس نہیں جا سکتا
زمین پر اکیلا رہنا
شیطانی عمل ہے

.....

نمرہ وارث کا شعری سفر طویل نہیں لیکن طوالت از خود کوئی مستند پیمانہ بھی نہیں، راستے اور منزل کے روایتی تصورات نے عمر اور وقت سے جڑے جو مہا بیانیے تشکیل دیے ہیں ان میں سے ایک تخلیق کار کی عمر کو حد سے زیادہ اہمیت دینا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی پچاس سالہ تخلیق کار کلیشے زدہ مصرعے سناتا ہے تو اسے پوری توجہ دی جاتی ہے جبکہ نوجوانوں/کم عمر لکھنے والوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ میری طرف سے نمرہ کے شعری جہان کی آبیاری کے لیے ڈھیروں دعائیں، یونہی نظمیں کہتی رہو، شاد رہو، آباد رہو

☆☆☆☆☆

لفظوں کے کچھ پھول

پچھلے تیس برس میں، میں نے
گئے ہوؤں پر لکھے کالم
کل یونہی جب جمع کیے تو کیا کیا چہرے
بھیگتی آنکھوں کے صحرا میں پھیل گئے
یک دم جیسے یادوں کا اک میلہ سا آباد ہوا
ایسی تھی وہ بھیڑ کہ مجھ کو سچ مچ گنتی بھول گئی

امجد اسلام امجد

گئے ہوؤں کی قبروں پر
یہ پھول چڑھانا واجب تھا پر
جتنی اُن کی یادیں ہیں اب
اتنے پھول کہاں ہوتے ہیں
کب یہ درد بیاں ہوتے ہیں

سونے جیسے ان لوگوں سے پھر سے ملنا
اور اک ایسی بھیڑ میں ملنا
رو کے سے جو رُک نہ سکے اور پَل پَل بڑھتی جاتی ہو
بامِ فلک پہ جیسے ہر سو
رنگوں سے معمور ستارے جگ مگ جگ مگ کرتے ہوں
اور آنکھ سنورتی جاتی ہو

کدھر کھلتا ہے در کوئی

گزرتا ہی نہیں ہے وقت
جبری چھٹیوں کا
ایک اک لمحہ صدی جیسا
گھریلو کھیل کوئی کب تلک کھیلے
کسی تقریب میں شرکت تو کیا
گھر سے نکلنے کی اجازت ہی نہیں ہے
اپنے پیاروں کے بھی چہروں سے
دل اکتانے لگے ہیں
بھولتے جاتے ہیں سب آداب
جو تہذیب کا حاصل تھے
سرمایہ تھے
خوش آہنگ بہتی زندگی کا۔
فاصلہ تو فاصلہ ہے
صرف جسموں تک نہیں رہتا
اتر جاتا ہے روحوں میں
ملاقاتوں کے آئینے دھندلے تو
اپنی پہچانیں بھی کھو بیٹھے
گلوبی گاؤں کا سپنا
ہمیں مہنگا پڑا اکتنا
کوئی رستہ نہ جب پائے
تو آخر آگ کے دریا میں بھی
انساں اتر جائے
کبھی ایسا نہ دن آئے!
دعا سے ہچکچائیں تو
چلیں آمین ہی کہہ لیں
کسی لمحے جھپکتی ہیں کہاں آنکھیں
بہت بے تاب ہیں
دیکھیں
کدھر کھلتا ہے در کوئی
کہ اپنے سب ہنر ہاری،
شکستِ زعم کی ماری ہوئی
بار دگر پرواز کی ہے منتظر دنیا
نئے آغاز کی ہے منتظر دنیا

جلیل عالی

قائداعظمؒ

وہ اب بھی قوم کے سینے میں دل بن کر دھڑکتا ہے
ہماری آرزوؤں میں وہ اب بھی رنگ بھرتا ہے
وہ فردوسِ بریں سے آج بھی
ارضِ وطن پر
روشنی بن کر اُترتا ہے

ہلاکت خیز تاریکی میں وہ خورشید کی صورت
مسلمانوں کے دل میں آخری اُمید کی صورت
اک آنے والے زریں عہد کی تمہید کی صورت

غلامی کی شبِ تاریک کو اُس نے مٹا ڈالا
وہ آزادی کی صبحِ عید بن کر سامنے آیا

یہ اس کا جذبِ کامل تھا
یہ اس کا عزم راسخ تھا
یہ اس کی عظمتِ کردار تھی اس کی دیانت تھی
یہ اس کا بے کراں فہم و تدبر تھا، فراست تھی
وہ شخصیت کسی قیمت پہ بھی جو بک نہ سکتی تھی
وہ ایسی ضربِ کاری تھی
جو ہر دشمن پہ بھاری تھی
وہ اعدا کے مقابل عزم و ہمت کا ہمالہ تھا
وہ قسمت کی جبیں سے چھوٹنے والا اُجالا تھا

اُسی کی پُراثر آواز نے
بکھرے ہوئے بھٹکے ہوئے لوگوں کو
اک وحدت بنا ڈالا
مسلمانوں کو اک ملت بنا ڈالا

وہ منزل اور مقصد کا تصور لے کے آیا تھا
عجب خوابِ حسیں اُس نے دیا آنکھوں کو
پھر اُس کو حقیقت میں بدل ڈالا
ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کو اس نے
روزِ روشن کی صداقت میں بدل ڈالا

وہ اب بھی قوم کے سینے میں دل بن کر دھڑکتا ہے
ہماری آرزوؤں میں وہ اب بھی رنگ بھرتا ہے
وہ فردوسِ بریں سے آج بھی
ارضِ وطن پر
روشنی بن کر اُترتا ہے

جمیل یوسف

واپسی

زمانے!
مرے ریگزارِ تمنا میں
اِک گنبدِ خواب کے پاس
کچھ پھول رکھے ہیں
اور دو کٹورے ہیں آنکھوں کے
جن میں مرے آنسوؤں کی نمی ہے
مرے گیت ہونٹوں سے گر کر
اِسی ریت میں ریت ہو کر پڑے ہیں
بچھڑ جانے والوں کی یادیں ہی زندہ ہیں
چہرے نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں
سلگتی ہُوئی نیند باقی ہے
آنکھیں نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں
تھکن جسم کی قبر میں سو گئی ہے
اُداسی مری ہم سفر ہو گئی ہے

زمانے!
مرے آخری رقص کا وقت ہے
وحشتِ شوقِ صندل کی مانند جلنے لگی ہے
رگ و پے میں
اَن دیکھی دُنیا کی خواہش مچلنے لگی ہے
چمکتی ہے تلوار سی کوئی قربِ گلو میں
ہے گونجی ہُوئی اِک ندا چار سُو میں
اُسی مہرباں کی
جو نیندوں کی سرحد پہ بھی جاگتا ہے

زمانے!
تو کیا مَیں ترے راستے پر نہیں چل رہا ہُوں
جو اِس طور دہکی ہُوئی آگ میں جل رہا ہُوں
مگر تجھ کو معلوم ہو گا
مرے ریگزارِ تمنا میں
کچھ پھول رکھے ہیں
جو مَیں تری نذر کو لا رہا ہُوں
زمانے!
پکارا ہے تُو نے
تو مَیں آ رہا ہُوں

خاور اعجاز

وائس ایپ

یہ ہیلو ہائے کی دنیا۔۔۔
یہاں پر ہر نئے پل اِک شناسائی
ہمارا ہاتھ تھامے ربط کو مضبوط کرتی ہے
یہاں پر جھوٹ چھُپ جاتا ہے اکثر
سچ کے چہرے میں
ایموجیز اور جی آئی ایف کی دنیاؤں میں
ہم تم سانس لیتے ہیں
ہمارے دل میں بہتے درد کو
یا پھر ہمکتی اِک خوشی، بے چارگی
اور بے بسی کو
اب انھی بے جان اشیا کی ضرورت ہے
یہ کچھ رنگین اسٹیکر
تاثر، لفظ، جذبے
اور لہجے کے امیں ٹھہرے
مقید ہو چکے ہیں ہم
انھی مصنوعی چہروں میں
کہیں غصہ کہیں شوخی
کہیں پر بے بسی، بے چارگی، شرمندگی
کو پیش کرتے ہیں
کوئی رو کر دکھاتا ہے
کوئی اِک مسکراہٹ کو جگاتا ہے

جو یہ اعلان کرتی ہے کہ جیون میں
بہت رنگین سبز اور کاسنی سے پھول کھلتے ہیں

مگر خوشبو سے عاری ہیں
تعلق اور رشتوں کی ہر اک ڈوری
بندھی ہے ایک میسج سے
کہ جب اِن باکس میں
میسج سبھی ڈیلیٹ ہوتے ہیں
تو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
مگر پھر اِک نیا نمبر
مگر پھر اِک نیا رشتہ
اور اُس کے بعد۔۔۔۔

حمیرا راحت

1985

ہر شخص خیال و خواب ہوا
ہر چہرہ نقش بر آب ہوا
ہر شعلۂ گل برفاب ہوا
ہم جن کے لیے بدنام ہوئے
وہ سارے عشق تمام ہوئے

اب موجِ ہوا کا ساتھ نہیں
وہ ابر نہیں برسات نہیں
وہ چاند نہیں وہ رات نہیں
کام آئے یا ناکام ہوئے
وہ سارے عشق تمام ہوئے

دامن پر کوئی داغ نہیں
اب طاق میں کوئی چراغ نہیں
اس دل کا کہیں سراغ نہیں
جس کے افسانے عام ہوئے
اب سارے عشق تمام ہوئے

اب اور کسی کا ساتھ نہیں
اب ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہیں
اب پہلے سے جذبات نہیں
بے مول ہوئے بے دام ہوئے
اب سارے عشق تمام ہوئے

دروازے پر دو آنکھیں ہیں
اس در کی اوٹ میں سانسیں ہیں
کچھ وعدے کچھ امیدیں ہیں
کچھ خوشیاں اور نویدیں ہیں
اک عشق کہ جو پائندہ ہے
جو عشق ہمیشہ زندہ ہے
وہ عشق جو مجھ کو گھر سے ہے
گھر کے دیوار و در سے ہے
جس گھر میں سب کا جیون ہے
جس آنگن میں تن من دھن ہے

صفدر صدیق رضی

سائے

تجھ کو دیکھا ہے دھوپ میں جلتے
جی جلاتا ہے اضطراب ترا
آگ سے کم نہیں ہے گرمی بھی
جس نے جھلسا دیا شباب ترا
کندنی رنگ ہو گیا ایسا
زرد دھوئیں کا شکار ہو جیسے
خستہ ہے خال و خد کی زیبائی
چاند زیرِ غبار ہو جیسے
تیرے چہرے کا حال ہے ایسا
جیسے مرجھا گیا ہو پھول کوئی
شاخِ زیتون تازگی کھوئے
اور ہو فاختہ ملول کوئی
تجھ کو تکلیف سے بچا لیتے
دکھ سے امن و امان بن جاتے
ڈھال بنتے تری تمازت میں
کاش ہم سائبان بن جاتے
جن کو دنیا درخت کہتی ہے
چھاؤں کا شامیانہ ہوتے ہیں
تھکے ہارے مسافروں کے لیے
بیٹھنے کا بہانہ ہوتے ہیں
دکھ ہے یہ ہم ہیں اُس قبیلے سے
جس نے کاٹے شجر، لگائے نہیں
اس کا باعث ہے کون اپنے سوا
اب اگر مہربان سائے نہیں

گلزار بخاری

''پاکستان ہمارا''

آنکھ کا تارا چاند ستارہ
اس دنیا میں سب سے بڑھ کر قومی نشان ہمارا
پاکستان ہمارا...

مر سکتے ہیں جھک نہیں سکتے غیرت والے ہم ہیں
جس کو شک ہو لڑ کر دیکھے ہمت والے ہم ہیں
جان وطن کی خاطر دینا ہے ایمان ہمارا
پاکستان ہمارا ...

فوج ہماری جرات والی لوگ دلیر ہمارے
مشکل وقت میں جم کر کھیلیں سارے شیر ہمارے
ڈر کس بات کا اللہ سائیں ہے نگران ہمارا
پاکستان ہمارا ...

دشمن بھی ڈرتے ہیں، ہم ہیں دھرتی کے رکھوالے
اک اک ذرے کی خاطر ہم کٹنے مرنے والے
جنگ میں یہ تکبیر کا نعرہ ہے سامان ہمارا
پاکستان ہمارا ...

مٹی اپنی آنکھ کا سرمہ مٹی نور ہمارا
چوم لیں مٹی تو یہ کر دے ہر دکھ دور ہمارا
مشکل ہر اک رستہ کر دے گی آسان ہمارا
پاکستان ہمارا ...

اقبال سروبہ

مغالطہ

علی اصغر عباس

نوجواں بن کے رہنے
اور ہونے میں کیا فرق ہے
سوچتا ہوں
تو سورج کی کرنیں
مری آنکھ میں
چاند تاروں کی ضوریزیوں کا برادہ
اجالے سے دھو کر
ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے بولتی ہیں
انہیں خواب کر لو
تو روزِ ازل کی
ابد گیر نوخیزیوں سے
شبابِ تحیر کو افزودہ کرتے رہو گے
فلک کی طرح روشنی سے منور رہو گے
زمیں کی طرف
نوری سالوں کی رفتار سے آتی کرنوں کے رنگوں
سے خود جان لو گے
جواں. نوجواں بن کے رہنے
اور ہونے میں کیا فرق ہے
تیرہ کرّوں
شہابوں کے ملبے پہ
سب کچھ لکھا ہے

دستِ ہنر زندہ ہے

یہ تم نے کون سے چہروں کو قیدی کر لیا ہے
کیسے لوگوں کو کچلنا چاہتے ہو
یہ کن ہاتھوں کو توڑے جا رہے ہو
کچھ ذرا سوچو
انہی ہاتھوں نے تم کو سردیوں کی کانپتی راتوں میں
اپنے تار جاں سے
کاڑھ کر شہ توس کی نرمی اڑھائی ہے
عروسِ فن سجائی ہے
ہوا سے بیل بوٹے وہ اتارے ہیں
جو برگ و گل کو شرمائیں
جو منکر ہوا سے بھی حسن کی جنت میں
لے جائیں
اسی تہذیب کو
امید کے پیراہن رنگیں پہ دھاگہ دھاگہ کر کے
ٹانکہ ٹانکہ
لمحہ در لمحہ بچھایا ہے
گلستاں کو تمھاری خوابگاہوں میں بلایا ہے
کبھی اخروٹ کی لکڑی پہ کندہ کر دیا ہے حسنِ دو عالم
کبھی آواز کا مرہم
تمھاری روح کے زخموں پہ رکھا ہے
یہی وہ انگلیاں ہیں
جو کبھی سارنگ کے تاروں کو چھیڑیں تو
ہوائیں رقص کرتی ہیں
انہی لوگوں کے دم سے
چاند کی کرنوں کو پکڑے
پانیوں میں
خواب کی پریاں اترتی ہیں
زمانہ کتنی صدیوں منتظر رہتا ہے
لیکن ایسے دست و پا نہیں ملتے
یہ وہ گل ہیں
جو زندانوں کے پنجروں میں نہیں کھلتے
یہ تم نے کیا کیا ہے
کیوں ہر اک ملبوس کالا ہے
یہ تم نے کیسے ہاتھوں کو گلے سے باندھ ڈالا ہے!
سنو دستِ ہنر زندہ ہے
یہ زندہ رہے گا
لاکھ تم زنجیر پہناؤ
یہ بہتر ہے اسے تم ظلم سے مجبور کر کے
سنگ باری پر نہ اکساؤ

شاہنواز زیدی

نوائے درد

اے دلِ مضطر بتا، جا کر سکوں پائیں کہاں
اس جہانِ آب و گل کو چھوڑ کر جائیں کہاں

اب یہاں پر چاہتوں کی محفلیں باقی نہیں
مائلِ الطاف پہلے کی طرح ساقی نہیں

ظلم کی چکّی میں پستے چار سُو انسان دیکھ
شش جہت پھیلا ہوا ہے موت کا سامان دیکھ

کاشمر ہو یا فلسطیں یا مرا بغداد ہو
خطۂ مسلم ہمیشہ زیرِ استبداد ہو

بن چکا شیوہ، چھپانا صدق کو، حق بات کو
چاپلوسی کے سبب، ہم دن بتائیں رات کو

سلب اپنی قوت گفتار، گویا ہو گئی
زندگانی، باعثِ آزار، گویا ہو گئی

گر ہلاتا ہے کوئی بھی عدل کی زنجیر کو
وہ لگاتا ہے گلے سے خنجر و شمشیر کو

ذلّتیں اپنا مقدّر بن چکیں، خاموش ہیں
کچھ نہیں سود و زیاں کی فکر یوں مدہوش ہیں

بات چلتی ہے فقط اب کفر کی، طاغوت کی
ہو رہی ہے پیروی، ہاروت کی، ماروت کی

ہے عدو اب کے بشر کا یہ بشر کیا کیجیے
ایک ہی آدم کے ہیں سارے پسر کیا کیجیے

سارے عالم میں کوئی بھی گوشۂ راحت نہیں
چین پانے کی یہاں اب کوئی بھی صورت نہیں

ہو گئے منکر، خدائے پاک کے احکام کے
ہیں تمنائی مگر، الطاف کے، اکرام کے

اشرف المخلوق انساں، رازِ حق کا راز داں
گر گیا ہے پستیوں میں، "الحفیظ والاماں"

ہے یہ دنیا اک تماشا جادۂ منزل نہیں
راہ رو بھٹکے ہوئے ہیں رہبرِ کامل نہیں

سوچ پہ چھائے ہوئے، یاجوج ہیں، ماجوج ہیں
کچھ سمجھ آتا نہیں، اذہان ہی مفلوج ہیں

ہم کو ہے کرنی بغاوت اب کے اُن حالات سے
ہم کو ہے باہر نکلنا، قلزمِ ظلمات سے

تا کہ پھر سے کام اپنا عدل کی تلقین ہو
زندگی اک بار پھر سے "اُدخلو فی الدین" ہو

شوکت محمود شوکت

یوم دفاع پاکستان

یومِ دفاع ملک منانے کے واسطے
پرچم کو رفعتوں پہ اُڑانے کے واسطے

پھولوں میں اتحاد کی خوشبو ہے لازمی
گلشن کی آبرو کو بچانے کے واسطے

برسایئے خلوص اخوت کے کھیت پر
پودے ترقیوں کے اُگانے کے واسطے

روحیں یہ کہہ رہی ہیں شہیدانِ قوم کی
ہو جاؤ ایک ملک بچانے کے واسطے

مٹی میں اپنے خون کی بوندیں اُتار کر
گھر سے نکل پڑے ہیں خزانے کے واسطے

محمد نوید مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ بھی مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

فلسطین جل رہا ہے

ہم اکیلے ہیں ساری دُنیا میں
بھیجتا کوئی بھی نہیں امداد
قدر کیا ہے ہماری دُنیا میں
کسی نے بھی رکھا نہیں ہے یاد

ہے جو دُشمن ہمارا اسرائیل
مُلک جتنے بھی ہیں یہاں مُسلم
اِس کو امریکہ دے رہا ہے ڈھیل
میں تو کہتا ہوں ہیں سبھی ظالم

یہ جو بچوں پہ بم برستے ہیں
سب کے سب ہیں غلام امریکہ
پانی کی بوند کو ترستے ہیں
بد سے بدتر ہے نام امریکہ

کر دیئے ہیں ہمارے گھر برباد
کون ہم کو بچانے آئے گا
اب بھلا ہم کہاں کریں فریاد
کب یہ وحشت کا دور جائے گا

بچے معصوم ہو گئے ہیں شہید
کیا ہمارے لیے خوشی کی نوید

عورتوں کو نہیں ہے بخشا گیا
اِس قدر کاری اُن پہ وار کیا

ملبے کا ڈھیر بن گئے ہیں مکان
اب ہیں آباد صرف قبرستان

شیر خواروں کو موت دے دی ہے
بربریت کی انتہا کی ہے

علی حسین عابدی

عقیدت

محسنِ اُردو ادب، عظیم محقق، عالی مرتبت استاذ اور نامور نقاد سید عبداللہ کی برسی پر

آسمانِ ملکِ اردو کے درخشاں آفتاب
سید عبداللہ تیری ذات ہے عالی صفات

خار زارِ نقد کو تو نے بنایا گل ستاں
کر دیا تنقید کو تخلیق کا یوں ہم زباں
فارسی کے پاسباں، اردو ادب کے نغمہ خواں
ہر محقق ہے تمہارے وصف میں رطب اللساں
سید عبداللہ تیری ذات ہے عالی صفات

تو نے اردو کے چمن میں جو اگائے ہیں گلاب
ختم ہونے کی نہیں ان کی مہک ان کا شباب
تیرے لفظوں کی رہے گی تا قیامت آب و تاب
تیرے خطبے اور کتابیں بے مثال و لاجواب
سید عبداللہ تیری ذات ہے عالی صفات

میر کے غم کی سنائی ہم کو تو نے داستاں
اور سمجھایا ہمیں غالب کا اندازِ بیاں
ہم پہ کیں اقبالؒ کے افکار کی پرتیں عیاں
ہیں بہت ممنون تیرے لفظ و معنی کے جہاں
سید عبداللہ تیری ذات ہے عالی صفات

تو نے اردو کو دیے بے مثل علمی ارمغاں
تیرے فکر و آگہی کے نقش ہیں یہ جاوداں
مٹ نہیں سکتے مٹائے تیرے قدموں کے نشاں
تو نے لیلائے سخن کو کر دیا پھر سے جواں
سید عبداللہ تیری ذات ہے عالی صفات
آسمانِ ملکِ اردو کے درخشاں آفتاب

مظہر حسین مظہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کی جھلمل دیکھ کے خالد جھولی پھیلا دی
دھوپ کے خوف سے ہم نے کیا تھا سورج کا انکار

ڈرائیور

امجد بابر

[نثری نظم]

رات
جب ماچس کی تیلی کے ساتھ جلتی ہے
وہ بادلوں سے خالی آسمان
چاند کے زرد چہرے کو تکتا ہے

ایک شہر سے دوسرے شہر کی مسافرت
سواریوں کی تلاش
سامان لادنے، اتارنے کی زحمت
اسے جگائے رکھتی ہے
وہ لوگوں کے نام، پتے اور راز
فراموش نہیں کر سکتا
انتظار کے موسم میں
بارش کی خواہش
اسے ہواؤں کے جبر سے دُور
عارضی پناہ گاہ میں لطف دیتی ہے
وہ اداسی کے کیفے ٹیریا میں
مسکرانے کا فن جانتا ہے

حالاں کہ
اس کی جیب میں
دُکھ اور آنسو ہمیشہ جمع رہتے ہیں

نثری نظم

اداسی دروازے پر دستک دے رہی ہے
آنکھوں کے دریچوں میں خواب رقص کناں ہیں
پلکوں پر آنسو ستاروں کی طرح دمکتے ہیں
زباں کو آنسوؤں کا ذائقہ لطف دیتا ہے
دل میری ناتمام خواہشوں کا مدفن
آنسو پی کر سرسبز رہتا ہے
زندگی کے پل صراط کو پار کرنے کے لئے
محبت کے جس صراط مستقیم
کی ضرورت تھی اسکا کوئی سرا
جذبوں میں الجھ کر کہیں کھو گیا ہے
سوچ کی پراگندگی نے من پر آلودگی کی تہہ چڑھا دی ہے
جو قبر میں نے اپنے ہاتھوں سے کھودی تھی
اس میں زندہ دفن ہو چکی ہوں
سانس کی گھٹن ہر لمحہ
زندگی سے رابطہ منقطع ہونے کا پیام لاتی ہے
تمہیں
تہنیت ہو کہ
مرنے سے قبل میری آنکھوں میں سوئیاں گاڑ دی گئی تھیں

تاکہ میں قاتلوں کی پہچان کھو دوں
مگر وہ جانتے نہیں
"دل کی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو ہی بینا کہتے ہیں"
"اداسی سے ہی سرخوشی کی کونپل جنم لیتی ہے"
اور
محبت تن آور درخت بنتی ہے

نائیلہ راٹھور

تلاش

بغیر جذبوں کے بہنے والے
یہ اشک گیسو کو ڈھونڈتے ہیں

جو کاغذوں کی بنے تھے زینت
گلاب خوشبو کو ڈھونڈتے ہیں

وہ جن سے گھائل پڑا ہوا تھا
وہ زخم آہو کو ڈھونڈتے ہیں

دھڑک رہے تھے جو مدتوں سے
وہ دل بھی پہلو کو ڈھونڈتے ہیں

پپیہے آواز خود لگا کر
چمن میں پیہو کو ڈھونڈتے ہیں

کبھی جو کاندھوں پہ تھے اکڑتے
وہ سر بھی زانو کو ڈھونڈتے ہیں

مگر نہ جذبے کو اشک و گیسو
نہ کاغذوں کو گلاب و خوشبو

نہ زخم آہو نہ دل کو پہلو
ملے پپیہے چمن نہ پیہو

نہ اکڑے کاندھے نہ سر نہ زانو
یہاں تو باقی ہے صرف ہا ہو

ملیں اگر تو پیام دینا
تلاش جاری ہے مدتوں سے

حسین کاظم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہوا میں رنگ نہ بھر دے مری اُڑان کہیں
وہ تیر چھوڑ نہ دیں کھینچ کر کمان کہیں

وطن

تجھ پر نثار کردوں میں اپنی یہ جاں وطن
باقی رہے گا دنیا میں' تیرا نشاں وطن

پربت حسین تیرے ہیں تُو بھی حسین ہے
دریا ترے رواں ہوں' یہ ہر دم رواں وطن

سارا کرم خدا کا ہے اُس نے وطن دیا
ہم کو ملے گا دنیا میں ' ایسا کہاں وطن

دشمن اِدھر جو دیکھے تو آنکھیں نکال دیں
دشمن کو مار ڈالیں گے ' تیرے جواں وطن

فرح شاہد

نظم

آنکھوں کی روشنی مدھم ہے
اور دل میں اندھیرے بستے ہیں

یہ بستی نہیں دل والوں کی
ہم دور یہاں سے چلتے ہیں

پروانوں کو احساس نہیں
ہم دیپک بن کر جلتے ہیں

کچھ گھر سے باہر افسردہ
کچھ گھر میں بیٹھ کے ڈرتے ہیں

بن مانگے خوشیاں مل جائیں
سب لوگ تقاضا کرتے ہیں

تُو کیا جانے ہم دنیا میں
کب جیتے ہیں کب مرتے ہیں

جب اس کو دیکھنا ہوتا ہے
قدموں میں آنکھیں رکھتے ہیں

تم فرح پاگل لڑکی ہو
یہ لوگ سیانے لگتے ہیں

خطوط

آصف ثاقب

ندیم ادب کے وارث محترم عمران منظور!

السلام علیکم! بیاض، مبارک قدم بروقت پہنچا، یہ آتا ہے تو سارے دلدر دور ہوتے ہیں۔ خالد احمد کی غزل کی قدر و قیمت وہ جانے جس کا دل گداز ہو اور ذہن روشن۔ تشبیب سے متعلق سیدہ آیت گیلانی کا مضمون اعتبار و اعتقاد کا اظہاریہ ہے۔ خالد احمد کی نعت کی خلوص اور عقیدت بھری شدتیں بے مثال ہیں۔ محترمہ سیدہ نے خالد احمد کے نعتیہ انکسار کی وضاحت اخلاص مندی سے کی ہے۔ محترم فتح محمد ملک نے جمیل یوسف کی شاعری کے اولیں دور کی فنی خوبیوں کا جائزہ بڑی محبت سے لیا ہے۔ فتح محمد ملک صاحب بڑے ادیب ہیں انھوں نے ایک بڑے شاعر کی ابتدائی شاعری کو اہمیت دی یہ اُن کی مہربانی ہے۔ ہمارے جمیل یوسف ادب میں پاکستان اور قائداعظم کی محبت اور عظمت کے اُجاگر کرنے والے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی نثر پاکستانیت سے بھرپور ہے۔

خدا انھیں اور توفیق دے۔ نذر عابد درس و تدریس میں ایک معتبر حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمی تدریسی خدمات کی فضیلت تسلیم شدہ ہے۔ میں نے ان کی کتاب تو نہیں دیکھی مگر ان کی شاعری کی بابت بہت کچھ سنا ہے۔ نثار ترابی ''ہزارہ ادب'' کے دلدادہ ہیں وہ یہاں کی ادبی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے نذر عابد کی کتاب کنارِ خواب کے خصوص میں ''خلوص آمیز'' گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عامر سہیل (شعبہ اردو ایبٹ آباد پبلک سکول) کا یہ ارشاد ان کے پیش نظر ہے۔

''نذر عابد کی شاعری میں زندگی سے وابستہ رویوں اور آدرشوں کا ایک جہان آباد ہے'' اس مضمون میں ڈاکٹر محمد سفیان صفی بھی مذکور ہیں۔ سفیان صفی پچھلے دنوں انتقال کر گئے۔ ان کی کمی کا دکھ بہت زیادہ ہے۔ غرض نثار ترابی کا تبصرہ خوب ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے کتاب ''پاکستانی ادب کے معمار آصف ثاقب فن اور شخصیت'' شائع کی تھی تحریر مشہور شاعر احمد حسین مجاہد کی تھی۔ تحریر کیا تھی قدرت کا کرشمہ ہے۔ احمد حسین مجاہد بوئی میں برپا ہونے والی کتاب کی تعارفی تقریب کا نقشہ بڑے ''رومان پرور'' پیرائے میں کھینچا ہے۔ وہ تحریر ''بوئی والا بابا'' بیاض، کے لیے بھیجتا ہوں آپ کے پاس میرا کلام موجود ہے آئندہ شمارے کے لیے نسیم سحر نے تصور اقبال کی شاعری کو ''حسن توجہ'' سے مالا مال کر دیا ہے۔ تصور اقبال میں بھی ''مراسلاتی آہنگ'' رکھتا ہوں۔

خیر اندیش

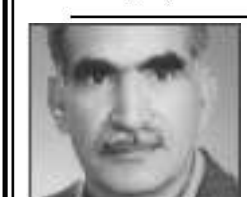

محمد ارشاد

محترم عمران منظور صاحب! اسلام

بیحد ممنون ہوں کہ خالد احمد نے 'بیاض' کے اولیں شمارے سے مجھ پر احسانات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا آپ اور آپ کے ساتھیوں نے اب تک جاری رکھ رکھا ہے۔ اللہ آپ لوگوں اور 'بیاض' کو سلامت رکھے۔ ندیم صاحب اور انہی کی طرح خالد نے اور اب آپ نے کئی جواہر قابل کی تلاش اور انھیں علمی و ادبی دنیا سے متعارف کروانے کا وسیلہ اپنے آپ کو بنایا ہوا ہے۔ یہ کارِ خیر آپ لوگوں کے اعمال ناموں میں نمایاں جگہ پائے گا۔ شروع شروع میں 'بیاض' میں معاونین و قارئین کے خطوط

شائع نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک کمی تھی جو جلد ہی دور کر لی گئی۔ فنون میں بھی خطوط کے لیے مختص صفحات ''اختلافات'' میں اختلافات کم اور تاثرات زیادہ ہوتے تھے اس لیے بعد میں ان صفحات کا عنوان بھی ''اختلافات وتاثرات'' کر دیا گیا۔ بعض اختلافات بیجا اور بعض بجا بھی ہوتے تھے لیکن بہرصورت فائدے سے خالی نہیں تھے۔ قارئین کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جلا ملتی تھی۔ ندیم صاحب فنون کے لیے موصولہ تحریروں کو بغور پڑھتے تھے اگر کوئی تحریر معیار پر پوری نہ اترتی تو صاحب تحریر کو واپس بھی کر دیتے تھے اور اگر کسی شعر یا کسی مصرعے میں گڑبڑ محسوس کرتے تو شاعر کو اس سے آگاہ بھی کر دیتے تھے۔ معمولی غلطی ہوتی تو خود ہی اسے دور بھی کر دیتے۔ میری کوئی تحریر انھوں نے کبھی واپس نہیں کی، البتہ کاٹ چھانٹ جو ہر مدیر کا حق ہے ضرورت پر ضرور کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنی کسی تحریر میں، عباؤں کی آستینوں کے الفاظ لکھے تھے۔ انھوں نے قباؤں کی آستینوں کر دیا۔ اردو میں عبا چادر کے معنوں میں مستعمل ہے اور یہی معنی ان کے پیش نظر تھے عربی اور فارسی میں عبا بھی قبا کی طرح ایک پہناوا ہے جو لباس کے اوپر پہنا جاتا ہے اور آستینوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ تہران میں شاہان قاچاریہ کے دور کا کاخ گلستان آج بھی موجود ہے، جس کے ایک حصے میں ایک میوزیم بھی ہے جس میں اس دور کے نوادرات موجود ہیں۔ اسی میوزیم میں قبا اور عبا ایک ساتھ لٹکتے دکھائی دیتے اور دشنہ اور خنجر ایک ساتھ۔ دشنہ اور خنجر میں فرق نظر پڑتے ہی معلوم ہو جاتا ہے لیکن قبا اور عبا میں فرق غور کرنے پر معلوم کرنا مشکل ہے۔ دونوں میں آستینیں تک موجود ہیں۔ عبایہ حج اور عمرہ کے وقت عورتوں کے لیے لازمی ہے، عبا ہی ہے البتہ ''خنجر خنجر ہے اور دشنہ دشنہ، دونوں میں نمایاں فرق ہے، غالب کے ان الفاظ ''دشنہ و خنجر کے بغیر'' پر معترض کا اعتراف کہ دونوں ایک ہیں غلط اور غالب کا مذکورہ جواب بالکل درست تھا۔ اب بھی درست ہے۔ دشنہ وہ چیز ہے جسے پشتو میں لور (بروزن شور) کہتے ہیں اور ختوں کے قبیلے ہوتیوں کا خاص ہتھیار ہے، جیسے کرپان سکھوں کا خاص ہتھیار ہے۔ لور کو ہری پور ہزارہ کی ہندکو میں کرچ کہتے ہیں۔ دشنہ درانتی نما ہتھیار ہے لیکن اس کے دندانے نہیں ہوتے اور پھل بھی درانتی سے چوڑا ہوتا ہے اور گولائی بھی درانتی کی سی نہیں بلکہ وسطی خم قائمہ زاویہ لیے ہوتا ہے۔ دشنہ، لور اور کرچ ایک ہی چیز ہیں۔ لور سے جنوبی پختونخواہ میں فصل اور گھاس بھی کاٹی جاتی ہے اور یہی کام شمالی پختونخواہ میں درانتی سے بھی لیا جاتا ہے اسی لیے درانتی کو بھی پشتو میں لور ہی کہا جاتا ہے۔ کاخ گلستان تہران میں تخت طاؤس بھی موجود ہے لیکن یہ وہ تخت طاؤس نہیں جسے پروفیسر افضل علوی اپنی کتاب، دیکھ لیا ایران، میں شاہجہان کا تخت طاؤس سمجھ بیٹھے، بلکہ فتح علی شاہ قاچار کا تخت ہے اور اس کا بھی اصل نام تختِ خورشید تھا نہ کہ تخت طاؤس۔ شاہجہان کے تخت طاؤس کو نادر شاہ افشار، جنوز دلی دور است کے قائل محمد شاہ رنگیلا سے چھین کر ایران لے گیا تھا۔ بعد میں آغا محمد خان نے اس کے جواہرات اتار لیے اور آج کسی کو معلوم نہیں کہ خود تخت کا کیا ہوا۔ یہ وہی آغا محمد خان ہے جس نے کرمان پر فتح حاصل کرنے کے بعد تمام بالغ مرد و زن کو قتل اور بچوں کو اندھا کروا دیا تھا اس ''جرم'' کی سزا کے طور پر کہ انھوں نے اس کا مقابلہ کیوں کیا تھا۔ اہل کرمان بارہ امامیہ تھے اور یہ ہفت امامیہ*۔ مجذوب فرنگی (نطشے) نے ہر ذی حیات میں Will to power کا سراغ لگایا ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو حصول قدرت و اقتدار کی خاطر ظلم و تعدی کا ارتکاب کرواتا ہے۔ نطشے کا Ubermensch وہ شخص ہے جسے آپ مرد کامل یا انسان کامل کہہ سکتے ہیں نہ کہ نازیوں کا ہٹلر نسل پرست۔ جرمنوں کی نسل پرستی کے سب سے بڑے مخالف کو عظیم نسل کے پرست کے روپ میں پیش کیا گیا کسی اور نے نہیں اس کی اپنی بہن الزبتھ نطشے نے جو اپنے ایک آشنا کے ساتھ جنوبی امریکہ کے ایک ملک میں بعد از شکست جرمنی، جا بسی تھی تاکہ خالص جرمن نسل پیدا کر سکے۔ معذرت خواہ ہوں کہ سخن گسترانہ بات بجائے مقطع کے مطلع میں آ پڑی ہے۔ بات ندیم صاحب کی احتیاط و احساس ذمہ داری کی ہو رہی تھی۔ ان کی زندگی کے آخری سال کے آخری مہینوں میں فنون کے لیے کچھ رباعیات بھجوائیں۔ ان میں سے ایک رباعی کا آخری مصرع۔ سامان مسلمانی سے پُر زنبیل۔ تھا چند دن بعد مجھے ان کا خط ملا جس میں انھوں نے اس مصرعے کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ میں نے جواب میں لکھا کہ مصرع مفعول مفاعیلن مفعولن فاع کے وزن (دیکھیے از

---

* آج کے ہفت امامیہ شیعہ پاکستان کے مہذب ترین شہری ہیں اور علی الخصوص ہنزہ و چترال کے بارہ امامی اور ہفت امامی دونوں اخلاقی لحاظ سے پاکستان کے سنیوں اور بارہ امامی شیعوں سے بدرجہا بہتر (م ا)

اوزان رباعی) پہ ہے اور ساتھ ہی تقطیع بھی کر دی۔ مطمئن ہو گئے۔ رباعی اصناف سخن میں مشکل ترین صنف سخن ہے اور اس کے جملہ اوزان کسی کسی کو یاد ہیں۔ غلطی کا امکان غیر متوقع امر نہیں۔ غالب کے سے بڑے شاعر سے بھی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب۔ غالب کی اس غلطی کو سب سے پہلے نظم طباطبائی نے نوٹ کیا۔ الہام چونکہ عالم بالا سے نازل ہوتا ہے اور ملہم محض وصل کنندہ اس لیے غالب کے کلام کو الہامی ماننے والے اسے کتابت کی غلطی کہہ کر کاتب کو ٹرپچر کا ذمہ دار قرار دینے لگے لیکن جب غالب کے اپنے ہاتھ سے لکھا مسودہ دیکھا گیا تو اس میں بھی یہ مصرع اسی طرح درج تھا۔ چونکہ نظم طباطبائی کا اعتراض بجا تھا لیکن کلام غالب کو الہامی ماننے والے یہ سوچ کر کہ غالب کے کلام پر اعتراض عالم بالا کی سخن دانی پر اعتراض ہے غالب کے دفاع میں طرح طرح عذر تراشنے لگے۔ آخری کوشش حامد علی خاں، رامپور نے کی۔ جو نگار لکھنؤ (جون 1959) کے باب المراسلہ والمناظرہ میں شائع ہوئی۔ فاضل مراسلہ نگار کے بقول اس "مصرع میں ہو سبب خفیف نہیں ہے بلکہ مخلوط پڑھا جائے گا۔ یعنی کر بندھ کا وزن مفعول ہے۔ اس میں کوئی رکن زائد نہیں ہے نہ مصرع غیر موزوں ہے شاید معترض موصوف بند ہو کو فاعلن کے وزن پر لانا چاہتے تھے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو یقینی طور پر مصرع غیر موزوں ہو جائے گا۔'' اس پر نیاز فتحپوری نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ '' فاضل مقالہ نگار نے جس کاوش و تاویل سے کام لے کر غالب کے زیر بحث مصرع کو موزوں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے قابل داد ضرور ہے لیکن تسلیم نہیں۔ تاویل کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ مصرع میں غالب نے 'بند ہو گیا' نہیں 'بندھ گیا' لکھا ہے یعنی بند کا دال ساکن نہیں ہے بلکہ اسے متحرک قرار دے کر ھ کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔ کیونکہ اس مصرع کے موزوں ہونے کا یہی ایک صورت تھی...... نظم طباطبائی قیامت تک یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص بند ہو گیا کو بندھ گیا بھی پڑھ سکتا ہے۔ مصرع جس کو طباطبائی نے غیر موزوں ظاہر کیا ہے میری رائے میں بھی غیر موزوں ہے اور وہ صرف اسی صورت میں رباعی کی بحر میں آ سکتا ہے کہ اس میں کر کو کے (کے) پڑھا جائے''۔ دیوان غالب کے بعض ایڈیشنوں میں یہی مصرع اب یوں بھی چھپ رہا ہے: دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب ___

مصرع رباعی کے وزن میں ضرور آ گیا لیکن جو معنویت رک رک میں ہے رک میں کہاں۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ تا گفتہ نہ رہے کہ خود نیاز فتحپوری کی کاوش و تاویل بھی حامد علی خاں (مراسلہ نگار) کی کاوش و تاویل سے مختلف نہیں۔ لکھا: '' ہو سکتا ہے (دوسرا مصرع یوں ہو

دم رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب

یعنی کر کی جگہ کے ہو جو کے پڑھا جائے گا اس طرح اس مصرع کی تقطیع یوں ہو گی

دل رک رک (مفعولن) ک بند ہو (مفاعلن) گیا ہے غا (مفاعلین) لب (فع) اس صورت میں دائرہ اخرم و اخرب دونوں کے ارکان اس مصرع میں شامل ہو جائیں گے، جو نا جائز نہیں۔'' نیاز فتحپوری کو خیال نہیں رہا کہ مفعولن کے بعد مفاعلن کسی صورت نہیں آ سکتا ہے (شجرہ اخرب)۔ اخرم و اخرب ارکان پر موزوں مصرعوں کا اجتماع صرف رباعی میں جائز یعنی ایک مصرع اخرم کے کسی وزن پہ ہو اور کوئی اخرب کے ارکان پر موزوں، مفعولن (اخرم) کے بعد مفاعلن، مفاعیل، مفاعیلن نہیں آ سکتے۔ اگر مصرع کے موزوں ہی بنانا مقصود تھا تو کر اور رک کو اڑا دیتے کہ کر اور رک کے بغیر موزوں ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

دل رک رک (مفعولن) کر بند (مفعول) ہو گیا (فاعلن) ہے غالب (مفعولن) غیر موزوں۔ مفعول کے بعد یا تو مفاعیل آ سکتا ہے یا مفاعیلن۔ کاوش اور تاویل بے فائدہ۔ پس دل رک رک (مفعولن) بند ہو (فاعلن) گیا ہے غا (مفاعیلن) لب (فع) یہی ایک صورت ہے اسے وزن رباعی میں لانے کی۔ جوش ملیح آبادی جتنے بڑے نظم گو تھے، اس سے کہیں بڑے رباعی گو تھے۔ ان کی ایک رباعی کا تیسرا اور چوتھا مصرع یوں ہے۔

اسلاف نے کھائے تھے کبھی ترش انگور

اخلاف کے دانت ہیں اب تک کھٹے

ترش فارسی کا لفظ ہے اور پہلے دونوں حرف متحرک ہیں تُرُش۔ اگر اردو بولنے والے تُرش بولتے ہیں تو جائز ہے بصورت دیگر مصرع غیر موزوں۔ دوسرا مصرع اگر جوش نے اسی طرح لکھا ہے تو غیر موزوں۔ اخلاف (مفعول) کے دانت ہیں (مفاعلن)

اب تک کھٹ (مفعولن) سے (فع)۔ مفعولن کی جگہ مفاعیلن چاہیے۔ اور مصرع یوں ہونا چاہیے: اخلاف کے دانت ہیں جواب تک کھٹے۔ لفظ جو کا رہ جانا کتابت کا سہو بھی ہو سکتا ہے۔ 'بیاض' جولائی کے شمارے میں ایک قابلِ احترام معاون کی پانچ ''رباعیاں'' شائع ہوئی ہیں لیکن پہلی رباعی اور پانچویں کے تیسرے مصرع کے سوا سب کے سب وزن سے خارج۔ میں تو ان مصرعوں کو کسی اور بھی وزن میں نہیں پڑھ سکتا۔

والسلام

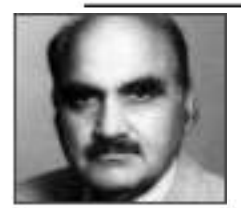

جمیل یوسف

مکرمی جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

اگست 21 کا 'بیاض' ہمارے پیارے وطن پاکستان کے پرچم کا آنچل اوڑھے نظر نواز ہوا۔ دل خوش ہو گیا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ آمین۔

میرا ابھی خیال ہے اور اس کا اظہار بھی ہے اپنے خطوط میں کرتا رہتا ہوں کہ 'بیاض' کی طرح دوسرے ادبی رسالوں میں چھپنے والے قلمکار صرف اپنے رشحاتِ قلم ہی پڑھتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ صرف اپنے لکھے ہوئے کو ہی پڑھے جانے کے قابل سمجھتے ہیں دوسروں کے ذکر اذکار سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا یہ گمان اس بار ایک بڑے دلچسپ انداز میں پایۂ ثبوت کو پہنچ کر یقین میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہوا یوں کہ میں نے اپنے پیارے دوست اور معروف شاعر و ادیب جناب نسیم سحر سے پوچھا کہ بیاض آپ کو مل گیا ہے؟ کہنے لگے۔ جی مل گیا مگر انھوں نے میرا خط شامل نہیں کیا۔'' میں نے ان سے کہا'' مجھے بیاض کا تازہ شمارہ ابھی تک نہیں ملا۔ براہِ کرم مجھے بتائیں کہ کیا میری کوئی چیز ہے؟'' فرمانے لگے'' مجھے تو نظر نہیں آئی۔'' میں نے ان سے درخواست کی کہ ذرا زحمت کریں اور از سرِ نو جائزہ لے کر مجھے بتائیں۔'' تھوڑی دیر بعد نسیم سحر نے بتایا کہ میری ایک نظم بہ عنوان ''عمران خان'' ہے۔ مگر اگلے دن جب پرچہ مجھے ملا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نسیم سحر کی غزل کے بالکل سامنے میری غزل چھپی ہوئی ہے مگر جو انھیں نظر نہیں آئی اور سب سے اہم چیز تک تو وہ پہنچے ہی نہیں۔

جناب پروفیسر فتح محمد ملک جیسے یگانۂ روزگار ادیب اور بلند پایہ نقاد نے اس ناچیز کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کی یہ تحریر بھی زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے۔

سید ریاض حسین زیدی

مدیرِ محترم عمران منظور / اعجاز رضوی

آپ کی ادارت، نئی تخلیقات کی ترتیب و تحسین اور روز افزوں موضوعات کی رنگا رنگ اشاعت نے 'بیاض' کے قد کاٹھ میں خاص اضافہ کیا ہے۔ خدانخواستہ میری نظر نہ لگے لیکن آپ نے ایسا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بانی مدیر خالد احمد (جسے میں مرحوم ماننے سے طبعاً قاصر ہوں) کی اولین غزل:

تند خوئی پہ طرح کر جاؤں
من کے خوشبو، ہوا کے گھر جاؤں

وہ اس مطلع کے معانی کی تصویرِ مجسم تھے۔ شگفتہ مزاج، ہمدرد، ملنسار اور بے حد خیر خواہ تھے۔ مجھے ٹی وی کے مشاعروں میں اہم جگہ دلانے میں ایسی پیش رفت کرتے کہ دوسرے رشک کرنے لگتے تھے۔ خیر غزل خالد لطف دے گئی۔ نسیم سحر کو خدا نے ہر موضوع پر بے پناہ لکھنے کی سعادتیں کھلے دل سے عطا کر رکھی ہیں۔ جناب آصف ثاقب کو شاعری میں شاندار نعت کے سبب نہایت رفیع مقام کا حامل ٹھہراتا ہوں۔ دونوں اصحاب کی ہر اشاعت میں حمد و نعت اور غزلیات وغیرہ دل میں گھر کرتی ہیں داستان سا ہیوال کے لکھنے والے جناب اکرم ناصر اور جناب عقیل رحمانی، ادب سرائے کی تحریک پر 'بیاض' میں خوبصورت تخلیقات کا ہر ماہ لوہا منواتے ہیں۔ آغا گل کے افسانے ''دروج'' نے کمال افسانہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ بلاشبہ عہدِ حاضر کے بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تمام تخلیقیں نہایت پُر تاثیر ہوتی ہیں۔ جمیل احمد عدیل ہر لحاظ سے منفرد اور شاہکار تخلیقات پر متصرف ہیں۔

کاش وہ نثری نظم کا پیچھا چھوڑ دیں۔ وہ ماشاءاللہ دوسری نظمیں لکھنے میں بھی کسی کم تری کا مظاہرہ نہ کریں گے۔ گلزار بخاری نظم لکھیں، غزل کہیں یا سلام کے پھول نظر نواز کریں، ہر جگہ اُن کی شاندار شاعری اپنا جوہر دکھاتی اور اپنا لوہا منواتی ہے۔
خدا تعالیٰ انھیں سلامت رکھے۔ امجد اسلام امجد کی ''نظمانے'' جلیل عالی کی بس کرونا نے خاص محظوظ کیا۔ جمیل یوسف نے عمران خان پر جو گوہر افشانی کی ہے، اس پر تبصرے کے جملہ حقوق محفوظ رکھتا ہوں۔ شاہ نواز زیدی میری مصورہ بیٹی سیدہ فاخرہ ریاض کے اُستاد ہیں، وہ اُن کے گُن گاتی رہتی ہے۔ اُن کی نظم ''جیپل'' خوبصورت تصویری پینٹنگ ہے۔

نسیم سحر

برادرم عمران منظور۔ سلام مسنون۔ اس خط کے ہمراہ گزشتہ ماہ کی ۱۰ر تاریخ کو بھیجا ہوا ایک مختصر سا خط بھیج رہا ہوں، ان دنوں طبیعت نرم گرم رہتی ہے (بلکہ شدید گرمی اور حبس میں گرم زیادہ رہتی ہے اس لیے اگست کے شمارے پر کوئی تبصرہ نہیں کر رہا اگرچہ اسے ملتے ہی پورا شمارہ پڑھ تو لیا تھا۔

۱۰ر جولائی ۲۰۲۱ء

السلام علیکم یا مدیران بیاض۔ خدا کرے سب بسلامت ہوں۔
خط کے ذریعے میری حاضری کچھ تعطل کے بعد ہو رہی ہے۔ اس دوران میں دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوا جس کے باعث بیاض اور دیگر شمارے موصول تو ہوئے مگر پڑھ نہ سکا اور اظہار خیال بھی نہ کر سکا۔ اب جزوی حد تک بینائی بحال ہو چکی ہے، ان شاء اللہ کچھ دن بعد مزید درست ہو جائے گی۔ چنانچہ سوچا بہت سے دوستوں نے تو میری غیر حاضری کا نوٹس بھی نہیں لیا مگر میں اس غیر حاضری کا جواز بنا کر مختصری حاضری بھی لگوا دوں۔
بیاض میں جناب جمیل یوسف کا خط پڑھا جس میں انہوں نے تقریباً سبھی شعراء کے پسندیدہ اشعار لکھے ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنی غزل کا صرف ایک شعر پسند کیا ہے حالانکہ ان کی پوری غزل ہی اچھی تھی۔ اسی طرح رفعت وحید صاحب کے چار شعر انہیں پسند آئے، اچھی بات ہے، اور ایک شعر میں انہیں کچھ کمی محسوس ہوئی تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ استاد شعراء کا یہی منصب ہوتا ہے۔
یاد آیا کہ میں نے گذشتہ مہینوں میں دو تین مضامین آپ کی خدمت میں ارسال کیے تھے مگر تاحال ان میں سے کسی کی باری نہیں آئی۔ یا پھر ناقابلِ اشاعت قرار دیے جا چکے ہوں!
مزید کچھ لکھنا مشکل ہو رہا ہے اس لیے بقول شخصے اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھیں۔ ہاں، جناب آصف ثاقب صاحب کو نئی کتاب کی اشاعت مبارک ہو۔ منتظر ہوں کہ شاید دستِ ساقی سے ایک جام ادھر بھی آئے کہ ہم اُن کے کلام کے دلدادہ بھی ہیں اور اُن سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ اللہ حافظ

محمد انیس انصاری

معظمی عمران منظور نعمان منظور صاحب
مدیر و معاون مدیر ماہنامہ بیاض، لاہور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے
اگست کا شمارہ سبز ہلالی پرچم کی ردا اوڑھے ملا۔ پس ورق پر نجیب احمد کی تصویر اور کتابیں دیکھ کر اپنی غزل کا ایک مطلع یاد آ گیا۔

اپنی کتابوں کے اوراق میں زندہ رہتے ہیں
اہل قلم دائم آفاق میں زندہ رہتے ہیں

جعفر طاہر نے کہا تھا:

تمہارے کمروں میں ہوں گی ہماری تصویریں
یہ کچھ دنوں میں تہِ خاک صورتیں ہوں گی

سنو! کہ پھر نہ سنو گے ہماری آوازیں ہمارے بعد تو مٹی کی مورتیں ہوں گی

نجیب احمد بھی زندگی کا آخری دن گزار کر نئے دیس کو روانہ ہو گئے۔ وہ چلے گئے مگر اپنے حصے کا کام بحسن و خوبی کر گئے۔ کتاب تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ اولاد بھی اپنی زندگی گزار کر چلی جاتی ہے مگر کتاب وہ اولاد ہے جو غیر فانی ہے۔ آج غالب اور میر زندہ نہیں مگر ان کا نام زندہ ہے۔ نجیب احمد ہماری ادبی تاریخ کا معتبر نام ہے کل کا مورخ جب معاصر ادب کی تاریخ لکھے گا تو اس نام سے صرفِ نظر نہیں کر پائے گا۔ اللہ تعالیٰ نجیب احمد کی نیکیوں اور بھلائیوں کو اس کے سارے اعمال پر غالب رکھے اور اس کی مغفرت فرمائے آمین۔ آپ نے خالد احمد کی دوستی کو نجیب احمد کی صورت احترام دیا۔ جزاک اللہ! ان کی کلیات اچھا قدم ہے۔ تا حال 'بیاض' کے حصہ غزل و نظم کا مطالعہ کیا ہے۔ نظم کا باب مستحکم ہے۔ اچھی نظمیں پڑھنے کو ملیں۔

خالد احمد کی "تمام نام ترے نام نے تراشے ہیں" جمیل یوسف کی "عمران خان" شاہنواز زیدی کی "پچھلا" فرحت پروین کی "تمھیں آزاد کرتی ہوں" خاور اعجاز کی "شہرِ ملتان، الوداع" طالب انصاری کی "خالی پن" شازیہ مفتی کی "الاؤ" اور فرحانہ عنبر کی نظم "اندیشہ" عمدہ تخلیقات ہیں:

غزل انتخاب میں خالد کے اس شعر نے چونکا دیا:

بت کو دیکھا تو بت ہوا خالد
جی میں تھا ، دیکھ کر گزر جاؤں
خالد احمد

دونوں روٹھے بیٹھے تھے
کرتی شام سہانی کیا
امجد اسلام امجد

ترے بخشے ہوئے ان جگنوؤں کی روشنی سے
یہ شب کچھ اور بھی تاریک ہوتی جا رہی ہے
جلیل عالی

مرے نگار اک ایسی شبِ وصال آئے
ترا وجود ، مری دھڑکنوں سے پیدا ہو
جمیل یوسف

میں اپنی اکائی کو توڑ دوں؟
تجھے دوسرا مان لوں میں؟
نسیم سحر

خود کو جتنی اڑان میں رکھنا
لوٹنا بھی ہے دھیان میں رکھنا
گلزار بخاری

کہاں تلاش کروں گمشدہ محبت کو
میں یہ خزانہ کہیں دفن کر کے بھول گیا
صفدر صدیق رضی

کوچہ شعر میں بیٹھا تو ہوں میں میرے پاس
پر مرا شور مرے اپنے ہنر سے اٹھا
خاور اعجاز

قبضے میں وڈیروں کے زمینیں ہیں تو راحت
تو صحن کے پودوں کو ہی باغات سمجھ لے
راحت سرحدی

وہ اندھیرا تھا ، کہ دم توڑ چکے تھے سارے
لوگ اُس شہر کے جگنو بھی چرا لائے تھے
منفعت عباس رضوی

تیرے چہرے سے شروع، اور ترے چہرے پہ تمام
میری تصویر کشی، گائیکی اور میرا کلام
شاہنواز زیدی

آپ کے ایک رنگ میں مل کر
ہم نے سب رنگ پا لیے صاحب
شبہ طراز

مرے چاروں اور یہ کس طرح کے حصار ہیں
مرے سامنے کوئی راستہ نہیں رہا
احمد جلیل

لوٹتے رہنے کے آزار میں آ جاتے ہیں
کتنے بھولے ہیں ، ترے پیار میں آ جاتے ہیں
آسناتھ کنول

اُس مٹی پہ واروں ہوں لاکھوں
جس مٹی نے خدا دیا مجھ کو
سید ضیا حسین

میرے پیچھے پڑی رہتی ہے روانی میری
نہیں سنتا یہ جی جہلم کا پانی میری
واجد امیر

دلِ سوختہ کا وہ داغ ہو، یا وہ منتوں کا چراغ ہو
ترے نام پہ، ترے بام پہ جو جلا دیا، سو جلا دیا
عاطف جاوید عاطف

تعلق توڑنا مشکل نہیں ہے
بس اک دیوار اُٹھے گی یہاں سے
ریاض رومانی

ایک مدت کے بعد سمجھا ہوں
ساری خوشیاں ہیں بس ترے دم سے
ظہور چوہان

مکالمہ رہا جاری ہماری آنکھوں کا
بدن کی شاخ پہ کھلتے ہوئے گلاب کے ساتھ
زعیم رشید

نام صغیر بتائیں کیوں
جب اس نے پہچانا نہیں
صغیر احمد صغیر

جنھیں جو لگتا ہوں، سرکار سمجھ لیتے ہیں
کچھ عدو مجھ کو کئی بار سمجھ لیتے ہیں
عزم الحسنین عزمی

رفتہ رفتہ سب معمول پہ آئے گا
وقت لگے سمجھنے میں بربادی کو
صائمہ اسحاق

کیوں اجنبی کی طرح یہاں مل رہے ہیں لوگ
میں بھی تو ایک فرد ہوں اس خاندان کا
ریاض ندیم نیازی

ہر ایک شخص یہاں بدگمان تجھ سے تھا
نگاہ یار ترا اعتبار کس نے کیا
کلثوم صفدر

ہمارے درمیاں اب کچھ نہیں رہا حائل
بدن ہے اور بدن کا اتہ پتہ نہیں ہے
اکرم جاذب

سرگرداں آج ہے کوئی میرے لیے مروش
جب کہ میں آج خود کو میسر نہیں رہا
نوید مروش

کہیں اترا تھا اب تک آبشاروں کی تہوں میں عکس میرا
مگر لہروں کے آئینے میں کل اک چاند جتنا تھا، کہ میں بھی
انجم عثمان

"ریاض" میں پہلی بار دیرینہ دوست اور معروف اہلِ قلم نوید مروش کو دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ انھیں ریاض فیملی کی ممبرشپ مبارک ہو۔ خوش آمدید، مرحبا، مرحبا!! اللہ نگہبان!!

آفتاب احمد ملک

مکرم و معظم عمران منظور صاحب

ہدیہ سلام و رحمت!

یوم آزادی مبارک چاند ستارہ خوبصورت سرورق دیکھ کر بے پایاں قلبی طمانیت ہوئی۔ جشن آزادی مبارک، پاکستان زندہ باد۔ وطنیہ شاعر جمیل یوسف کی غزل و یوم آزادی کے تناظر میں صفحہ 83 پر پڑھی:

مرے نگار اک ایسی شب وصال آئے
تیری صدا کا گماں، آہٹوں سے پیدا ہو
اُسی میں دہر کی رنگینیاں سمٹ آئیں
وہ حرفِ سادہ جو میرے لبوں سے پیدا ہو

ترتیبی لحاظ سے حمد کے بعد نعت گو شعرا کے کلام میں عشقِ رسولِ اعظمؐ کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ درود پاک کے ذکر کے بغیر نعت مکمل نہیں ہوتی ـــــ مثلاً

درود پاک سے ثاقب فلک سے نور برسے
یہ ساون اور برساتیں محمدؐ کے لیے ہیں
آصف ثاقب

اعجاز ہے درود کا ہاں اس کے ورد کا
جو ڈوبتا سفینہ تھا، ساحل پہ آ لگا
سید ریاض حسین زیدی

صدق دل سے درود جب پڑھیں
دل مدینہ ہمیں دکھاتا ہے
عقیل رحمانی

جب درودوں کے تار چھڑ جائیں
پھر کوئی فاصلہ نہیں ہوتا
سرور حسین نقشبندی

''شاہ داستان'' میں شاہ جی تھائی لینڈ کے مندروں میں قارئین کو گھماتے پھرتے ہیں۔ شاعرانہ لفاظی حیرت ناک لفظوں کے جادوگر سفرنامے کے ساتھ ذاتی، ملکی اور عالمی ترقی کے تناظر میں رازہائے درون خانہ سے پردہ اٹھانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، جنرل جیلانی سے مکالمہ اور حکومتی بیوروکریسی کی اندرونی کہانیوں کے رازدار شاہ جی کمال، جمال وجلال کا شخص ہے کم صفحات پڑھ کر ماہانہ انتظار اشد من الموت ہے۔

کتب بینی میں نئی سات کتابوں پر تبصرہ جات پڑھ کر مصنفین کی عملی وادبی کاوشوں کی داد دی جاتی ہے۔ (صفحہ نمبر 169-149) مضامین کے صفحات پر معروف 8 شخصیات کے انکی تصانیف وتالیفات کے حوالہ جات سے فکری ومعلوماتی تحریروں کے خوبصورت گلدستے ہیں۔ (صفحہ نمبر 216-178)؛ معلوم زیر نظر شمارے میں تصوف پر سلیمان عبداللہ زار کا روحانی مضمون نہ تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہتا تو اچھا تھا۔ شمارہ اگست میں تخلیق کار احباب کی 73 غزلیات اور 19 نظمیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ غزل ونظم میں نئے رنگ، استعارے وتخیلات نمایاں ہیں۔ طوالت سے بچاؤ کی خاطر چند شعرا کی غزلیات کے اشعار نذر قارئین ہیں:

فقط بیان حقیقت نہیں ہے منزل حق
جہت شناس وہ ہے جو جہت نما بھی تو ہو
خالد احمد

گاؤں کے اس بوڑھے برگد کی گھنیری چھاؤں میں
مل کے جو گاتے تھے وہ نغمے پرانے یاد کر
اقبال سرویہ

ہم اپنے خون کی لرزش سے ہاتھوں کو مصور کرتے ہیں
ہر نغم کی خام لکیروں سے تصویر بنانی ہوتی ہے
آصف ثاقب

تیری تخلیق سے ظاہر ہے کہ تو ہے موجود
نامور ہوں تو مصور کبھی لکھتے ، نہیں نام
شاہنواز زیدی

سب کا ایک ٹھکانہ ہے
درویشی ، سلطانی کیا
امجد اسلام امجد

لفظوں میں حسن یار سمیٹوں تو کس طرح
حیرت ہے مجھ کو لوح و قلم دیکھتے رہے
احمد جلیل

کوچہ شعر میں بیٹھا تو ہوں میں میر کے پاس
پر مرا شور مرے اپنے ہنر سے اٹھا
خاور اعجاز

یہ ستم کم تو نہیں خواب فروشوں کے لیے
لے کے تعبیر کو دربار میں آ جاتے ہیں
آسناتھ کنول

قبضے میں وزیروں کے زمیں ہیں تو راحت
تو صحن کے پودوں کو ہی باغات سمجھ لے
راحت سرحدی

یاروں سے ضبط حال کے تالے نہیں کھلے
ہم سے بھی ساز دل کا بجایا نہیں گیا
افتخار شاہد

سکندر اپنی شوکت پر، پریشاں آپ ہے، لیکن
قلندر مسکراتا ہے ، قلندر رقص کرتا ہے
شوکت محمود شوکت

بچی عمروں نے کیا ہجر شناسا واجد
ہو گئی ختم لڑکپن میں جوانی میری
واجد امیر

دونوں نوجوان شاعروں کے خاکے پڑھے۔ شاہد ماکلی کی آنکھ ہیروں کی متلاشی ہے حوصلہ وعزت افزائی کے لیے ممنون ہوں۔

نو وارد پنچھیوں کی اصلاح لازمی ہے۔
5 خطوط نگار دوستوں کی ناقدانہ آرا خوب ہیں۔
اندرونی صفحات پہ 8 نئی کتابوں کے رنگین ٹائٹل دیکھ کر مصنفین و مرتبین کو اشاعتی دلی مبارکباد دیجیے گا۔ نیز بیک ورق پر نوید صادق کی ترتیب و تدوین یعنی کلیات نجیب احمد دیکھ کر گمان ہوا شاید یہ شمارہ گوشہ نجیب احمد ہے۔
241 صفحات پر مشتمل 'بیاض' کا شمارہ نئے تحریری مضامین کا مجموعہ اور اس کی ترتیب و اشاعت پر جریدہ کی انتظامیہ دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔
زعیم رشید کے دو اشعار جو "بزمِ تخلیق" کے شرکا نے پسند کیے:

ہم اہلِ درد پکارے گئے صحیفوں میں
ہم اہلِ عشق اتارے گئے کتاب کے ساتھ

مکالمہ رہا جاری ہماری آنکھوں کا
بدن کی شاخ پہ کھلتے ہوئے گلاب کے ساتھ

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب
بہت احترام اور مسنون سلام
'بیاض' کا شمارہ بابت اگست 2021 نظر نواز ہوا۔ دل جذبات ممنونیت سے بھرا ہے۔ ماشاء اللہ 'بیاض' بہترین ادارت اور اپنے شمولات کے معیار کی وجہ سے ادبی دنیا میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔
زیرِ نظر پرچہ میں جناب آغا گل کا افسانہ بہت پسند آیا۔ آغا گل ایک منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ ان کا افسانہ "دروج" محبت کی محض جذباتی داستان بن جانا اگر وہ کہانی کے مرکزی کردار کو آغاز میں ہی نفسیاتی الجھن میں مبتلا ظاہر نہ کرتے۔ افسانہ کا ہیرو روز بروز انسانی ہلاکتوں، اغوا، گم شدگی جیسے واقعات کا مشاہدہ کرتے کرتے حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ افسانے کا ہیرو مبتلائے محبت ہونے کے بعد بظاہر نفسیاتی مرض سے صحت یاب ہو جاتا ہے، تاہم اس کے دماغ میں کہیں نہ کہیں ان انسانیت سوز مظالم کی تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ انسانی خون کی یہ بے حرمتی اسے اس مقام پر لے آتی ہے کہ وہ محبت میں ناکامی کے بعد اپنا ہی خون کر لیتا ہے۔ افسانہ نگار نے کمال ہنرمندی سے اس کی نفسیاتی پیچیدگی کو بروئے کار لا کر افسانے کو نہایت خوبصورت موڑ عطا کیا اور اسے عام جذباتی افسانہ ہونے سے بچا لیا۔ یوں یہ افسانہ ایک نئی جہت کا حامل بن رہا۔ تخلیق کار نے اسے نفسیاتی الجھن کے ساتھ جوڑ کر دل چسپ انجام دے دیا اور بین السطور ایک نئی جہت عطا کر دی ہے۔ فنکار میں یہ سلیقہ وسعتِ مطالعہ اور افسانہ نویسی پر مکمل گرفت کا غماز ہے۔ رنگر افسانے بھی اچھے تھے۔ ہم محترمہ آسناتھ کنول صاحبہ کو ایک شاعرہ کے طور پر جانتے ہیں۔ کہانی کار کے طور پر بھی ان کی فنی سلیقگی قابلِ تعریف ہے۔
سید شرکت علی شاد صاحب کی آپ بیتی کی قسط دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا تھی۔ انھوں نے قارئین کو تھائی لینڈ کی سیر کروائی۔ ہمارے پاکستان میں بدھ عہد کی ایسی باقیات موجود ہیں جو تھائی لینڈ کے مندروں اور پگوڈوں سے زیادہ پرانی اور بدھ مت کو ماننے والوں کے لیے نہایت عقیدت کا مقام رکھتی ہیں۔ گندھارا تہذیب کے مرکز تکسی شیلا (ٹیکسلا) کو اگر مکمل طور پر دریافت لیا

جائے تو یہاں مشرق بعید سے سیاحوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جائیں، مگر وائے جو سرجان مارشل دریافت کر گیا، ہم اس اثاثے کی بھی مناسب حفاظت نہیں کر پا رہے ہیں۔ آہنی قوتوں کی بالادستی کے سبب قوم میں طالبانی سوچ سرایت کرتی جا رہی ہے۔

غزلیں کچھ بہت اچھی تھیں اور کچھ مناسب تھیں۔ سہیل یار کے ہاں تازہ کاری نے مزہ دیا۔ چند اشعار جو بہت پسند آئے:

اس دور میں بھی عشق کرے گا مرے گا کیا
تو نوکری اگر نہ کرے گا کرے گا کیا

تھوڑا بہت دماغ سے لینا پڑے گا کام
دل ہی تمام فیصلے کرتا رہے گا کیا

سہیل یار

اپنا کردار میں اس ڈر سے تجھے سونپتا ہوں
مجھ پہ ہی ختم نہ ہو جائے کہانی میری

واجد امیر

مری وفاؤں کی گہرائیوں کا کھوج تو لے
وہ عکسِ حسن کبھی ظرف آزما بھی تو ہو

خالد احمد

دیگر مندرجات بھی لائقِ تبصرہ ہیں، مگر سب پر بات کی جائے تو خطِ لیلیٰ کی زلف کی طرح دراز ہو جائے گا۔ سو یہیں پر تحست بالخیر ایک غزل 'بیاض' کے لیے ملفوف ہے۔ احبابِ بیاض کی خدمت میں سلام

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم

اگست ۲۰۲۱ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ حسبِ سابق غزلوں، نظموں اور نثر پاروں سے سجا ہوا خوبصورت سرورق کے ساتھ دیدہ زیب رسالہ۔ پہلے کی طرح شاعری کے گلدستے میں کئی کھلتے ہوئے پھول مہک رہے ہیں۔

شروع میں حمد و نعت کے گلدستے مہکتے ہوئے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بقول گلزار بخاری:

اسی دار شفا سے لوٹتے ہیں کامراں ہو کر
جنھیں چارہ گرانِ عصر سے درماں نہیں ملتا
(گلزار بخاری)

غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

در کو دیوار کر لیا جائے
رشتہ ہموار کر لیا جائے
(انصر رشید انصر)

ترکِ تعلقات کی ٹھانی تو چل سکی
لیکن وہ شخص دل سے بھلایا نہیں گیا
(افتخار شاہد)

امجد اسلام امجد بڑے خوبصورت شعر کہتے ہیں ان کی نظمیں کمال کی ہوتی ہے۔ یہاں ''نظمانے'' سے ان کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے

عزت اور محبت کے بن
ملنے والی شہرت سے تو
گمنامی ہی بہتر ہے
(امجد اسلام امجد)

خالد احمد کی نظم ''تمام نام ترے نام نے تراشے ہیں'' میں خدا سے اپنے لبوں کی بے دیا دعاؤں کو سننے کی گزارش کی گئی ہے۔

تمام نام ترے نام نے تراشے ہیں
دلوں کی تال، سبک جھانجھنوں کی جھنکاریں
تمام سحر ترے اسم کے تماشے ہیں (خالد احمد)

خالد احمد کا شعر نظر انداز ہونے کے دکھ کو بیان کرتا ہے:

رکھتا ہے یہاں کون خبر عیب و ہنر کی
خالد ہمیں کس نے نظر انداز کیا ہے

جلیل عالی نے موجودہ دور کے کورونا وائرس کو اپنی نظم 'بس کرونا' کا موضوع بنایا ہے۔

فرحت پروین کا افسانہ "سلور جبلی" بے پایاں محبت کے اظہار کا اظہاریہ ہے۔

آغا گل اپنے افسانے 'دوزخ' میں ایک جگہ تعلقات کے ڈیٹا (Data) کے حوالے سے موبائل کو اجتماعی قبر قرار دیتا ہے۔ ثمینہ سید "بندھن کا بوجھ" میں ان لوگوں کے دکھ اور درد کو بیان کرتی ہیں جو بندھنوں کے نیچے دبے کراہ رہے ہیں۔

فتح محمد ملک کا جمیل یوسف کے حوالے سے اور اسلام عظمی کا شفیق سلیمی کے حوالے سے کئی در کھولتے ہیں۔

اعجاز روشن نے اپنے مضمون میں اکرم کنجاہی کی کتاب مابعد جدیدیت اور چند معاصر غزلین کے حوالے سے ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

یہ شمارہ خوبصورت غزلوں، نظموں افسانوں اور مضامین سے مزین ہے۔ جو ہمیں عصر حاضر کے ادب سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا خط ہے جس میں تفصیلی مضمون قلم بند نہیں کیا جا سکتا اسی لیے دیگر ادیبوں شاعروں کے کلام کی خصوصیات کو چاہنے کے باوجود اتنے کم الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

دردانہ نوشین خان

مکرمی عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

یہ حقیقت تو سمجھ میں آ گئی ہے ادبی برادری کوئی برادری نہیں ہوتی۔ اس میں شامل رہنا یا نہ رہنا ذات کی طمانیت ہے۔

میں بوجہ سانحہ انتقال ہمشیرہ و بہنوئی کافی مہینے 'بیاض' کی اشاعتوں سے غائب رہی۔ اب حاضر ہوں۔ غائب و حاضر سے کوئی فرق نہیں پڑتا مدیران کو، ادیبوں کو، شاعروں کو نہ قارئین کو، دنیا اسی کا نام ہے ۔ ادب بھی بس دنیا ہی ہے۔

'بیاض' اگست 2021 کا سرورق حسب سابق ہے۔ اگست تو ماہ پاکستان ہے۔

آسناتھ کنول کا افسانہ "بیٹے کی واپسی" امید رکھتا ہے۔ کرونا سے وابستہ ادب میں اب امید کو داخل ہونا چاہیے۔ دن تھک گیا ہے درد سے۔

افسانہ "ریچھ" بدصورت خبروں کا زہر رکھتا ہے فرخندہ شمیم لکھتی ہیں:

"ان دنوں ابھی امپرومنٹ نہیں ہوئی تھی۔ بچے بوڑھے اور جوان بے فکر ہو کر میدانوں میں ریچھ کے تماشے دیکھتے تھے، بچیاں بھی اس وقت ریچھ سے نہیں ڈرتی تھیں خواہ انھوں نے چھوٹی چھوٹی فراکیں ہی کیوں نہ پہن رکھی ہوں۔"

آغا گل کا افسانہ "دوزخ" کی لائن "ایک کامیاب ٹھیکیدار کو دو عورتیں بالشرکت کرنی چاہیے" دلچسپ ہے مگر افسانہ ہنسی مذاق نہیں دل سوز ہے طارق کی تمام تر مظلومیت کے باوجود جی چاہتا ہے کہ طارق کا موبائل تو دوزخ کو دے دیتا (سب کے لیے راحت تقسیم کرنی چاہیے)

نوین روما نے "بعنوان" وائرس کی ترقیاں اور مستقبل کے مزید عذاب پر خوب لکھا ہے۔

طالب انصاری صاحب نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ نئے لکھنے والوں کے ہاں نیا اسلوب بہت لطف دیتا ہے (شاعری کے بارے میں) غالباً شاہد ماکلی ہر ماہ ایک تازہ کار شاعر کا تعارف دے رہے ہیں۔ ایک بات واضح ہے جو شاعری "جسم جاناں کی تعریف ممکن نہیں" سے باہر نکلتی ہے۔ زندہ حقائق کے اندر سے برآمد ہوتی ہے یعنی موضوعاتی شاعری وہی متاثر کرتی ہے۔ آج کا نوجوان شاعر یہی کر رہا ہے۔ اس طرز فکر کا آغاز جون ایلیا نے کیا تھا۔
نثری نظمیں بھی اس خواہش کی کاوش ہوتی ہیں۔ نوید صادق صاحب کو کلیات کی اشاعت کی مبارکباد
غیر مطبوعہ افسانہ "منبع خلیفہ" لائی ہوں۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، محترم اعجاز رضوی
السلام علیکم!
اگست کے "بیاض" کا سرورق پاکستان کے خوبصورت پرچم کی دلکش عکاسی تھا۔ آزادی کے دن ہمارے ہاں خوب ہلا گلا ہوتا ہے اور کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ کوئی اور ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ہمیں جشن آزادی ضرور منانا چاہیے، مگر نئی نسل کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آزادی ناچنے، گانے اور بیہودہ حرکتیں کرنے سے نہیں ملی تھی بلکہ اس کے لیے ہمارے اجداد نے خون کے دریا عبور کیے تھے۔ ہمارے ہاں آج بھی ایسے بزرگ موجود ہیں۔ جنھوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ جنھوں نے اپنے عزیز و اقارب، گھر بار اور مال و اسباب کی قربانیاں دیں۔ جنھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کو شہید ہوتے دیکھا۔ ذرا ان سے اس آزادی کی قیمت دریافت کریں تو احساس ہوگا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ بغیر کسی تکلیف کے آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔
افسانوں میں فرخندہ شمیم کا "ریچھ" معاشرے کا بھیانک چہرہ دکھا رہا تھا اور آج کے حالات کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ چھوٹے بچوں اور بچیوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات کے بعد آج والدین کو اپنے بچوں کے حوالے سے زیادہ حساس ہونا چاہیے۔
فرحت پروین، آشا تھ کنول اور ثمینہ سید کے افسانے بھی اچھے تھے۔ کچھ غزلوں کے یہ اشعار پسند آئے:

کس کی قسمت میں غم نہیں ہوتے
غم چھپانے سے کم نہیں ہوتے
ہم تو دریا کے دو کنارے ہیں
اور کنارے بہم نہیں ہوتے
منفعت عباس رضوی

مرتے دم تک نہیں بھولی تیرے آنچل کی مہک
ماں ترے دودھ کی تاثیر جدا لگتی ہے
ان کے سینے پہ کھدے نام مہکتے ہیں عقیل
ان درختوں کو محبت کی دعا لگتی ہے
عقیل رحمانی

خشک جھیلوں سے پرندے بھی تو اڑ جاتے ہیں
یوں نہ ہو ہم بھی ترے شہر سے ہجرت کر لیں
ہم غلط بات پہ خود سے بھی الجھ جاتے ہیں
کیسے ممکن ہے ترے ہاتھ پہ بیعت کر لیں
اشرف کمال

ہم اہل درد پکارے گئے صحیفوں میں
ہم اہل عشق اتارے گئے کتاب کے ساتھ
ہمیں یہ خوف اندھیرے نگل نہ جائیں کہیں
سو ہم نے جسم کو ڈھانپا ہے آفتاب کے ساتھ
زعیم رشید

مختلف کتابوں پر تبصرے بھی دلچسپی سے پڑھے۔ خاص طور پر امجد اسلام امجد، تسنیم سحر اور عافر شہزاد نے بھرپور تبصرے لکھے۔
نظموں میں جلیل عالی کی "بس کرو نا" اور جمیل احمد عدیل کی "سپنا کوئی دیکھنے کی چیز ہے" بھی پسند آئیں۔

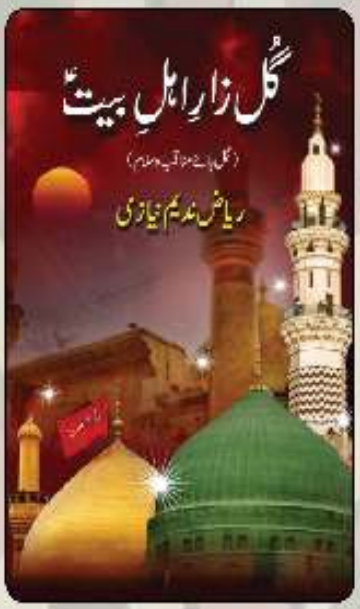

گل زارِ اہلِ بیتؑ
ریاض ندیم نیازی

تنقید کی دنیا
محمد نوید مرزا

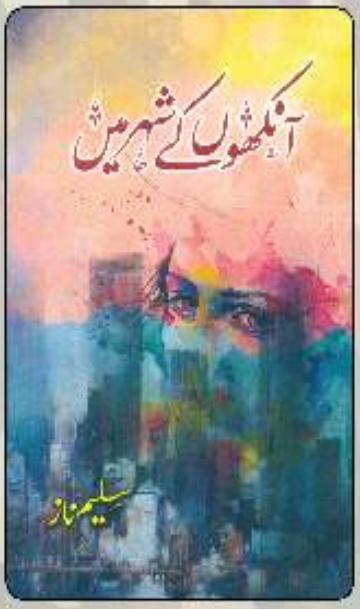

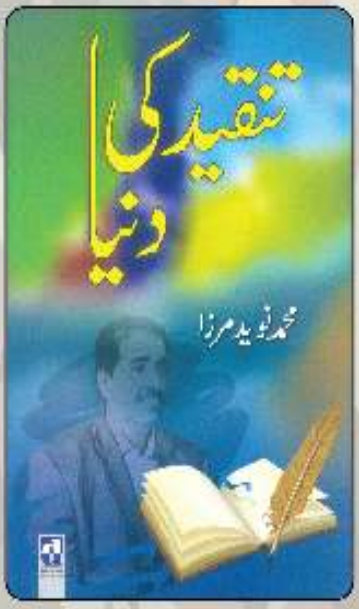

آنکھوں کے شہر میں

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888